ماہنامہ
فروری 2023ء

طلوعِ اسلام

لاہور
اشاعت کا اِسی واں سال

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

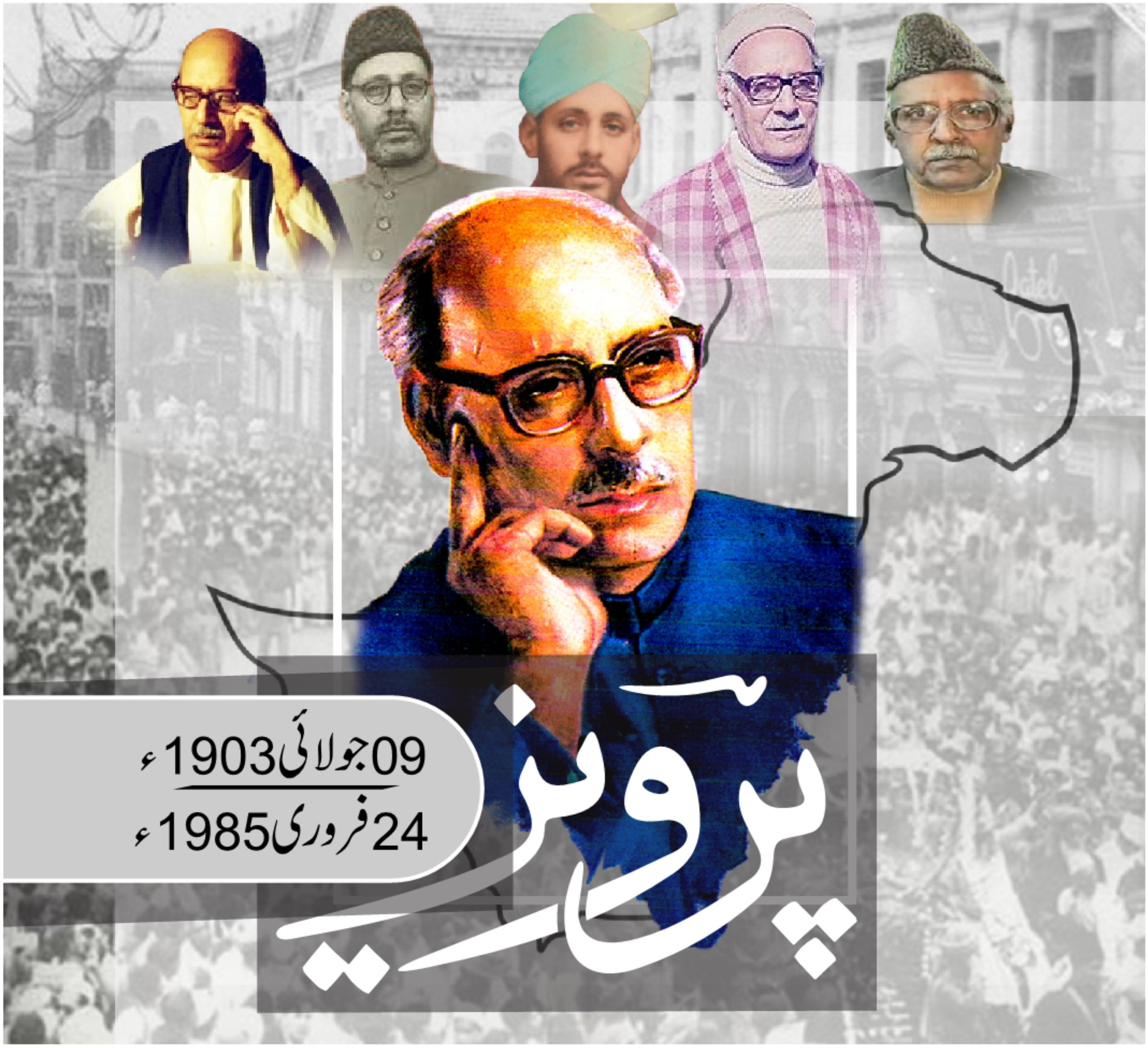

پرویز

09 جولائی 1903ء
24 فروری 1985ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
فروری 2023ء

جلد 76 شمارہ نمبر 01

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: غلام احمد پرویزؒ اور تحریکِ طلوعِ اسلام	ادارہ	4
علامہ پرویزؒ اور موجودہ دور کے سکالرز	آصف جلیل، کراچی	19
سال 2022ء ایک جائزہ میری نظر میں	ڈاکٹر اعجاز رسول، گلاسگو، یوکے	22
دو انتہاؤں کے درمیان توازن بدوش راستہ	سبیل شاہین، اٹک	25
قرآنی ہدایت پر انسانی ذات کی مقصدیت کا انحصار	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	30
انتخابات اور قرآن	خواجہ ازہر عباس، کراچی	35
ارتقاء (ایک تخیل، ایک حقیقت)	ڈاکٹر سنبل، اسلام آباد	40
ک ت ب	لُغات القرآن	49
میرا پیام (گذشتہ سے پیوستہ)	پرویز علیہ الرحمہ	52

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) **Episode No. 13**	**60**

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	**For International Transactions**
Bank A/C No: 0465004073177672	**IBAN:PK36NBPA0465004073177672** **Swift Code: NBPAPKKAA02L**

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

غلام احمد پرویزؒ اور تحریکِ طلوعِ اسلام

(مختصر تعارف)

علامہ اقبالؒ نے دمِ واپسیں فرمایا تھا:

سرُودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

علامہ غلام احمد پرویزؒ (رحمۃ اللہ علیہ) کی ولادت مورخہ 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آپ کے دادا، مولوی، چوہدری، رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہر طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیر نگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہو چکی تھیں۔

بعد ازاں سول سروس میں چلے گئے اور 1954ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تا کہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران میں آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ 1932ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمۂ ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ:

> اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت تا بہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جراَتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

''عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان

کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔''

علامہ پرویزؒ کی بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ نظریہ' اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہوسکتی ہے قرآن کی نہیں۔ اس لئے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) (سید سلیمان ندوی کی زیرِ ادارت) کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت تا بہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جرأتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

1926ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہو گیا ہے لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

آخر الامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

علامہ اقبالؒ کے خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلۂ ''معارف القرآن'' کی ابتدا 1928ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا۔ ''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی۔ جس میں آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ۔ جن۔ شیطان۔ وحی۔ رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے نور''۔ چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلۂ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ۔ ''انسان نے کیا سوچا''۔ کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ عقلِ انسانی۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام

رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے۔ آپؒ نے ایک کتاب بعنوان۔ ''اسلام کیا ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں معاشی نظریات کی بنیاد پر دنیا دو بڑے بلاکوں میں منقسم تھی۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لئے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظام ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہانِ فردا!'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں کے تصورات کس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے۔

یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ جناب پرویزؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطۂ عوامی کے ایک آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآنِ مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا' یا ہو رہا ہو' ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کون سی ہے جس کے زیر انتظام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر

مشتمل تھی، جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی، نہ جماعت، نہ کوئی مالی ذریعے تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیرلبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابل فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد، رابطۂ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی، تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کر لے، سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے (اس نے اسے بتا دیا تھا)۔''

> قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی

(طلوع اسلام، دسمبر 1978ء صفحہ:49)

سلسلۂ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور ''مطالب الفرقان'' کے نام سے تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام خطوط'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اسلامی معاشرت اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین۔ بعنوان ''قرآنی قوانین'' اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔۔ (Islam a Challenge to Religion) اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد

جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لئے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپؒ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو فخریہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوع اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیا کریسی رائج کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قراردادِ مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماء سنت کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لئے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پرزور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف فتویٰ کفر دے دیا جس پر ایک ہزار ''علماء'' کے دستخط ثبت تھے۔

ضخیم تصانیف کی لمبی فہرست۔ ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات۔ ہفتہ وار درس اور تقاریر کے ٹیپس (Tapes) کا ڈھیر جو اب سی ڈی/ ڈی وی ڈی میموری کارڈز کی شکل میں دستیاب ہیں نیز تسوید کے بعد طباعت بھی ہو رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان میں، باوجود سرکاری ملازم ہونے کے سرگرم شمولیت، قائداعظمؒ سے قرب حاصل ہونے کے باوجود مراعات حاصل کرنے سے انکار، اپنے خلاف فتوؤں سے بے پروا ہو کر اپنے مشن میں مگن۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ کھنگال ڈالئے۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا شخص جس نے تنِ تنہا اتنا زیادہ اور اتنا ٹھوس کام کیا ہو؟

5 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ اور 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دار فانی سے انتقال فرما گئے۔

کیونکہ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ (55:26-27) ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

☆......☆......☆

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

(بانیٔ تحریکؒ کے الفاظ میں)

تقسیم سے قبل گو طلوعِ اسلام کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوعِ اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام' ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا' وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کرسکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جاسکتا۔

> جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جارہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جارہی ہے۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لے کر حصولِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصولِ مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اس کے نمایاں خط وخال امت کو دکھائے اور قرآن ہی کی روشنی میں اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب' سعید روحیں اور جو قرآنِ کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف وجوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھاسکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پر جمع کرلیا جائے اور اس طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہوجائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط وخال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔ محترم پرویزؒ صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالۂ طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں

نقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آپ چہار اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویزؔ صاحب نے جو طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت میں پیش کیا ہے' یہ ہے:

(1) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(2) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(3) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(4) رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(5) رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا یہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر وتبدل کیا' جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(6) بدقسمتی سے خلافت علی منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا' اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(7) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے' جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد ورسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(8) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے' نہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(9) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان ومکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے

لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم وفنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(10) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات وتاریخ میں ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جن سے حضور ﷺ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحنِ چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(11) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے' احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔

(12) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوجائے تا کہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(13) قرآنی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آئند ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط وخال جنہیں طلوع اسلام .... نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھا تا رہا اور یہی تھی آہن کی وہ فسان جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو گئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہیئت کا نام ''بزم طلوع اسلام'' ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو

جائے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل و بصیرت کی رو سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے اور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جا رہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوع اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام و عمل کی پیامبر ہے ان حالات میں ایک طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ 'دین خطرہ میں ہے۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابیٔ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہیئے۔ سوشل ورک کر کے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کر کے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہیئے۔

اندریں حالات، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد' نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دیں۔

دستورِ اساسی واصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے:۔۔

''بزمِ طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ' یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں' انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہدِ محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔''

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ 1956ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دور حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں......قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت' ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے' بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے' سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا' ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے' انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظم کوشش (Organised Effort) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہو گا کہ پارٹی بازی اور منظم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحزب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آجاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (Loyal) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اسکی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔

دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو' وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزاء کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر ہوتا ہے' جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں............ یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے' وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں' ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں' ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی' خدا کی صفتِ رب العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمہ زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از بیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں''۔

ایک دوسرے مقام پر پرویزؒ صاحب نے فرمایا:

''قرآنِ کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں' اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکتا' اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا''۔

ایک اور مقام پر موصوف نے کہا:

''حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے' انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رو سے احترامِ انسانیت' انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ یہ تبدیلی یقین (Conviction) سے آتی ہے اور (Conviction) کی بنیاد دلائل

وبراہین کی رُو سے دل ودماغ کے اطمینان پر ہے۔اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں‘‘۔

’’دنیا میں ساری قوتوں کا راز‘ ایمان میں مضمر ہے۔جس قدر آپ کا یقین محکم ہے اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔شکست وکامرانی کا بنیادی مدار ساز وسامان پر نہیں‘ یقین اور عدم یقین پر ہے۔جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب وشادکام ہوں گے۔یہی شکست وفتح کا اٹل پیمانہ ہے۔اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔جب یقین ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہوا اللہ واحد القہار پر تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلا سکتی‘‘۔

’’(نظام خداوندی) کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔شعور کی یہ بیداری اور فکر ونظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کے عام کرنے میں اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگہِ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔اسی کا نام تعلیم کتاب وحکمت ہے۔نبیٔ اکرم ﷺ نے اسی نقطہ سے آغاز کار کیا تھا...... اس تصور کو عام کرنے سے ایسے‘ سعادت مند افراد نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت ہوتی ہے۔اسی کا نام نفس کی بالیدگی ہے اور تعلیم وحکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے‘‘۔

تعلیم وحکمت کی وضاحت کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے لکھا:

’’تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔کسی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آ جائے‘ تعلیم ہے۔تعلیم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہو سکتی ہے قلبی ایقان نہیں۔دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں ہوتی‘ اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے‘ جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیر فکر پر نہیں وہ نظام کبھی نشوو ارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہو سکتا۔اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب ونگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔عمل کا محرک جذبہ‘ قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کا تعلق دل سے ہے‘ دماغ سے نہیں۔اس لئے تنہا علم عمل کا محرک نہیں ہو سکتا۔قرآن اس قسم کی سوسائٹی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی ذات کی تسکین محسوس کرے۔قلب کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلابِ عظیم آ جاتا ہے۔قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے‘‘۔

(موصوف نے کہا)۔’’قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔

وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ، عقل اور عشق، جنون اور خرد، ذکر اور فکر، خبر اور نظر، دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں، وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ ''جنون اور خرد'' جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔۔۔اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج جس میں نہ تو جنون مذہبی دیوانگی سکھا دے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے، قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ ''خرد وجنون'' جنہیں وہ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:190-191) سے تعبیر کرتا ہے۔یعنی وہ اربابِ عقل وبصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہنمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں، یہی ہیں وہ مکمل عدل کا ''خواب'' دیکھنے والے جو اس ''خواب'' کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہوں''۔

طلوع اسلام کی دوسری سالانہ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے پرویزؒ صاحب نے فرمایا:

''جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع وشریٰ کا معاملہ کرتی ہے اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے۔ کس قدر روپیہ فراہم کیا۔ کتنے جلسے کئے، کتنے جلوس نکالے، مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں وغیرہ وغیرہ۔لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں، وہ اپنی ذات، اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں''۔

طلوع اسلام کی ساتویں کنونشن میں موصوف نے کہا:

''انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے' قدیم تصوراتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے' ملوکیت' سرمایہ داری' مذہب' سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں......اس وقت لاؔ کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد' ان کے مقام سے ہٹانے' یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے''۔

طلوع اسلام کی نویں کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا' مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ جو شخص لوگوں کے سامنے ان کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے' پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے' اسے ان کا مسلمہ لیڈر' راہنمائے شریعت یا مرشد طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص ان کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے' انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے' وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا' اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اسکا قائد بن جانا' میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر' قرآن کی آواز پر لبیک کہوں' اور اس طرح دنیا جہان کی مخالفت مول لے لوں' میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے' سوچتے سمجھتے کیا اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُرخار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخِ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اے مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے' مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ تو دین کا خاصا ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسے کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہ رہے تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہوجانے کے بعد اگر اس قوم کے سامنے دین نہ ہو تو وہ دہریت اختیار کرلیتی ہے اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست مستقل اقدار سے الگ ہوجاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصا یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آجائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہٗ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رخ کرے یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے''۔

طلوع اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں پرویزؒ صاحب نے اراکین بزمہائے طلوع اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں نے زمیلانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اس روشنی کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد نہایت سکون و خامشی لیکن انتہائی التزام واستحکام کے ساتھ قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری کا کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستور اساسی کی ایک شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیں گے اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفاد عاجلہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون واطمینان سے برداشت کرنا اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل کر مرجانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے دوسری طرف مفاد عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گزر جانا ہے کہ اس کی کوئی کشش وجاذبیت آپ کی دامنگیر نہ ہو''۔

یہ ہیں قرآنی حقائق پر استوار اس تنظیم کے مقاصد اور یہ ہے وہ مخصوص اور متعین طریقِ کار (ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب) جسے اس تحریک نے اپنے روزِ اول سے اختیار کر رکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ اس قسم کی تحریک آپ کے تعاون کی مستحق ہے یا نہیں۔ والسلام!

آصف جلیل، کراچی

علامہ پرویزؒ اور موجودہ دور کے سکالرز

میں علامہ پرویزؒ کے بارے میں لکھتے ہوئے بخوبی اس کا حق ادا نہ کرسکوں گا کیونکہ قرآن کریم کے لئے ان کی ان گنت خدمات ہیں جن کا احاطہ کرنے کے لئے سینکڑوں صفحات بھی کم پڑ جائیں۔ آج اگر میں تھوڑا بہت قرآن کریم کو سمجھ پایا ہوں وہ انہیں کی وجہ سے ہے۔ روایتی مذہب کی نہ سمجھ آنے والی بالجبر پابندیوں کی وجہ سے میں نے اس مذہب سے بغاوت کردی تھی اور دہریت کی سمت جانے والا ابتدائی قدم اٹھالیا تھا۔ اگرچہ دہریت کوئی سمت متعین کرتی ہی نہیں ہے، اس کی سوئی صرف انکار کرنے پر اٹک جاتی ہے۔ قرآن کریم کی طرف آنے کے لئے پہلی بنیاد 'لا' ہی ہے لیکن اگر اس کے بعد 'الا اللہ' کی طرف نہ آیا جا سکے تو انسان ایک ہی دائرے میں چلتا رہتا ہے جو کسی منزل تک نہیں پہنچاتا۔ اس لحاظ سے میرے لئے بہت خوشی کا مقام ہے کہ میں چوبیس سال کی عمر میں علامہ پرویزؒ سے متعارف ہوا۔ میں ان کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے قرآن کریم سمجھنے کے لئے موقع فراہم کیا۔ میرے لئے وہ ایک عظیم استاد کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے میں نے بالواسطہ قرآن کریم سمجھا۔ ان کا عطا کردہ بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو ان کی بے شمار کتب پر مشتمل ہے جو زندگی کے ہر گوشے کا احاطہ کرتی ہیں۔ کئی دہائیوں تک وہ درس قرآن دیتے رہے جو آڈیو اور ویڈیو کی شکل میں محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی انتھک اور دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے جو آنے والی کئی نسلوں کے لئے کافی ہے۔ ان کی وفات کے بعد ادارہ طلوع اسلام نے جس کی بنیاد انہوں نے رکھی تھی، ان کے ان دروس کو کتابی شکل میں بھی منتقل کیا۔ ان کی بہت سی کتب کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان کی کئی ایک کتابوں کی آڈیو بن چکی ہیں جو ان لوگوں کے لئے نہایت مفید ہیں جو اردو سمجھ سکتے ہیں لیکن پڑھ نہیں سکتے۔ آڈیوز کے ساتھ ساتھ تحریر بھی سکرین پر نظر آتی ہے۔ دو سال سے زائد عرصہ سے بیرون ممالک رہنے والوں کے لئے انگلش میں قرآنی آیات کی تشریح زوم پر پیش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا کے تمام پلیٹ فارمز پر یہ سب کچھ موجود ہے جس سے ابلاغ کا فریضہ سرانجام پا رہا ہے۔

آج کل سوشل میڈیا کا دور ہے جس میں بہت سے سکالر سامنے آ رہے ہیں جنہوں نے عمر کا کافی حصہ پرویز صاحب کے درس سننے اور ان کی کتب سے استفادہ حاصل کرنے میں صرف کیا ہے۔ اچانک انہیں یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ وہ علامہ

پرویزؒ جیسا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔اس کے لئے بات یہاں سے شروع کی جاتی ہے کہ ہمیں شخصیت پرستی نہیں کرنا چاہیے اب ہم ان سے آگے کی سوچ لے کر آئے ہیں۔اگرچہ پرویز صاحب نے اپنی تحریروں اور تقاریر میں بار باراس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کی کہی ہوئی باتوں پر غور وفکر کر کے قبول کرنا چاہیے جس سے تقلید کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔انہوں نے کئی ایک مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے کہ ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔اس کی وضاحت آئندہ آنے والے کر سکیں گے لیکن یہ کونسی تحقیق ہے کہ ان کے مفہوم میں معمولی ردوبدل کر کے اپنی تفاسیر لکھی جائیں۔لغات القرآن سے معانی نکال کر انہیں اپنی کاوش قرار دیا جائے۔اپنے ذہن میں آنے والے خیالات کو قرآنی سند دی جائے۔بعض یہ فرماتے ہیں کہ مجوسیوں کی لغات سے قرآن کریم نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایسا کرنا خلاف قرآن ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ گرائمر عجمیوں کی ایجاد ہے لہٰذا اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔حالانکہ کسی بھی زبان کو سمجھنے کے لئے یہ بہت اہم ہے۔ ایک صاحب کی خوداعتمادی کا یہ عالم ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ وہ جو مفہوم لیتے ہیں وہ عرب بھی نہیں لیتے۔یہ ان کا (ایجاد کردہ) اطلاقی مفہوم ہے۔یعنی لوگوں کو آنکھ بند کر کے آمنا وصدقنا کہنا ہوگا۔قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کو بھی بغیر سوچے سمجھے ماننے سے منع فرمایا ہے۔پرویزؒ صاحب جیسی قدآور شخصیت نے جس دور میں کمپیوٹر موجود نہیں تھا کہ اس سے مدد لی جا سکتی بہت محنت سے لغات القرآن مرتب کی جس میں انہوں نے جو بھی مفاہیم لئے ان کی سند عربوں کی ڈکشنریوں سے پیش کی تاکہ اہل تحقیق کی تشفی ہو سکے۔سوشل میڈیا کے استعمال نے خودساختہ سکالروں کے لئے بہت سے مواقع مہیا کر دیئے ہیں۔کچھ حضرات اپنی تقاریر کی ویڈیو بنا کر فیس بک اور واٹس ایپ گروپوں میں پھیلا رہے ہیں۔کچھ اپنی تحریروں کو عام کر رہے ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ نہ تو دین کے نظام کی بات کرتے ہیں اور نہ مکافات عمل کی۔اس طرح ان کی باتوں کا کوئی اثر انسانوں کی زندگی میں پڑ سکتا ہے نہ یہ نتیجہ خیز ہیں۔یہ اس بات کی احتیاط کرتے ہیں کہ کہیں سے علامہ پرویزؒ سے ان کی نسبت نہ ہو سکے۔بعض اب اس دنیا میں نہیں رہے،ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے لیکن یہ سوچنے کا مقام ہے کہ اس سے قرآنی نظام کے لئے کیا خدمت سرانجام دی جا رہی ہے۔

کچھ لوگوں کو اس بات کی بہت جلدی ہے کہ قرآنی نظام ان کی زندگی میں آ جائے۔ان کا خیال ہے کہ تحریک طلوع اسلام کو ایک سیاسی پارٹی بنا دیا جائے جس میں ان کے خیال کے مطابق لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے۔ایسا کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ ادارہ طلوع اسلام کے دستور اساسی کے خلاف ہے۔اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ یہ قرآن کریم کی بنیادی شرط کے منافی ہے کہ کوئی تبدیلی ممکن ہی نہیں جب تک انسانوں میں تبدیلی نہ آئے۔جب ان لوگوں کی بات نہیں مانی گئی تو انہوں نے طلوع اسلام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اپنی سیاسی پارٹیاں بنا لیں۔اس وقت قرآن کے نام پر دو سیاسی پارٹیاں موجود ہیں جبکہ اگر پارٹی ہی بنانی تھی تو سب لوگ ایک ہی پارٹی میں شامل ہو جاتے دو کس لئے؟ ان میں چند لوگ ہیں اور ان کی کارکردگی صفر کے برابر بھی نہیں لیکن خودسری انہیں اپنی غلطی تسلیم کرنے نہیں دیتی۔

بعض کا خیال ہے کہ قرآن کریم کا طریقہ کار بہت طویل ہے کیوں نہ ہم کوئی مختصر راستہ اختیار کرلیں۔ان کے دلوں میں غریبوں کا درد اٹھ رہا ہے۔قرآن کریم نے ایک نظام کے ذریعے تمام لوگوں کے مسائل اوران کی مشکلات کا حل پیش کیا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب حکومت مومنین کے ہاتھ میں ہو اور تمام ذرائع پیداوار ان کے تصرف میں ہوں' جن سے نہ صرف ہرایک کو رزق کریم ملے بلکہ ہرطرح کی سہولیات میسر ہوں۔اب اس کا علاج ان کے نزدیک یہ ہے کہ غریبوں کے لئے فلاحی کام کئے جائیں۔اس سے گنتی کے چندلوگوں کو وقتی مدد مل جاتی ہے لیکن باقی کروڑوں کی حالت زار اسی طرح برقرار ہے۔ان کا کون پرسان حال ہوگا؟ مملکت کے وسائل اسی طرح مخصوص ٹولے کے ہاتھ میں ہی رہیں گے اور غربت مسلسل پیدا ہوتی رہے گی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ سب باتیں کرنے کا مقصد کیا ہے؟اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ''نام'' لینے والے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ بنا کر بالواسطہ طور پر قرآنی نظام کی راہ میں روکاوٹ بننے کا سبب بن رہے ہیں۔یہ بھی فرقہ واریت کی ایک قسم ہی ہے۔اگر ان کے پیش نظر قرآنی نظام کا قیام ہوتا تو وہ تحریک طلوع اسلام کا بازو بن کر اسے مضبوط کر سکتے تھے۔ایک مرکز کے ماتحت اپنے وسائل اوراپنی توانائیاں صرف کرتے تو اس کا زیادہ مؤثر نتیجہ نکلتا۔یہ ایک نہایت اہم سبب ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو لگتا ہے کہ تحریک طلوع اسلام جمود کا شکار ہے۔حالانکہ وہ قرآنی نظام کے قیام کی بنیادی شرط کے مطابق تغیرِ نفس کا عمل ہرممکنہ طریقوں سے کر رہی ہے۔جب تک لوگوں کی ایک بڑی اکثریت اس نظام کو دل کی گہرائی سے قبول نہیں کرے گی جس طرح یہ نظام صدیوں سے قائم نہیں ہوسکا اسی طرح نہ جانے اور کتنی صدیاں لگ جائیں۔اوراگر قرآنی نظام سے متعلق نظریاتی شرح صدر کے نتیجے میں تغیرِ نفس پیدا ہوجائے تو قرآنی سماجی انقلاب ہمارے تصور سے بھی تیز تر برپا ہوسکتا ہے۔باطل نظام میں رہتے ہوئے اس میں تھوڑی بہت مرمت کرتے رہنا اللہ تعالیٰ کا مقصود نہیں ہے۔اس نے تو جدوجہد کرنے کا کہا ہے نتیجہ تو اس کے قانون کے مطابق ہی نکلے گا۔اس کا نظام مومنین کے ہاتھوں ہوگا اور ایک مرکز کے ماتحت ہوگا۔جو لوگ سمجھتے ہیں کہ چند منتشر اور متذبذب افراد اٹھ کر اس باطل نظام کو تبدیل کر سکتے ہیں نتیجہ بتا دے گا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔جس قوم کی اکثریت بنیادی اخلاقی اقدار سے عاری ہے وہ کس طرح اسے قبول کرسکتی ہے؟ قرآن کریم سمجھ لینے والوں کو سوچ سمجھ کر اپنی سمت کا تعین کرنا ہوگا۔

ضرورتِ رشتہ

بیٹا عمر: 22 سال' تعلیم: آئی سی ایس' رہائش: لاہور' گیمنگ سافٹ ویئر کمپنی میں کام کررہا ہے۔

جس کے لئے موزوں رشتہ کی ضرورت ہے۔درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں۔

رابطہ نمبر: 0321-4060830

ڈاکٹر اعجاز رسول، گلوسگو، یو کے

سال 2022ء ایک جائزہ میری نظر میں

علامہ پرویزؒ نے اپنے ایک لیکچر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ وہ چند الفاظ میں یہ ہے کہ قرآن کو سمجھا جائے اور پھر اُسے دوسروں کو سمجھایا جائے۔ اس کے لئے ایک دفعہ لاہور بزم کے اراکین کو خطاب کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ ہر ہفتہ جو درس ہوتا ہے اُس میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہو کر سمجھیں اور پھر دوسروں کو سمجھائیں۔ سال 2022ء بھی اسی طریقہ کار کو Follow کرنے کی ایک کوشش تھی۔

2021ء کی طرح ہم نے Zoom پر 2022ء میں بھی اپنی قرآنی تعلیم کی کوششیں جاری رکھیں۔ چار سورتیں یعنی سورۂ یوسف، سورۂ رعد، سورۂ ابراہیم اور سورۂ الحجر مکمل کر لیں۔ ابھی سورۃ یونس جاری ہے۔ اس تعلیم کا طریقہ کار یہ رہا کہ ساری آیات کو مطالب الفرقان اور مفہوم القرآن کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جائے اور اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے کہ ان میں دین کے لحاظ سے کن پہلوؤں کی طرف اللہ نے ہماری توجہ مبذول کروائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال کیا گیا کہ حالاتِ حاضرہ کے مسائل کا کیا حل قرآن نے پیش کیا ہے۔ بار بار اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ جو دنیا ہمارے اردگرد ہے وہ انسانی عقل کی بنائی ہوئی ہے۔ اگر ہم اس سے مطمئن ہیں تو پھر قرآن کی تعلیم ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ یعنی ہم قرآن کو بحیثیت دین کے نظام کے نہیں پڑھیں گے بلکہ ایک عام کتاب کی طرح ہی مطالعہ کریں گے تو اس سے موجودہ حالات کا جہنم بجھانا ممکن نہیں ہوگا۔ البتہ اگر ہم دل سے موجودہ دنیا کا متبادل ڈھونڈیں گے تو پھر قرآن سے ہمیں مدد ضرور مل جائے گی۔

ان لیکچرز کو youtube پر ڈال دیا گیا ہے تاکہ اور لوگ بھی فیضیاب ہو سکیں۔ ان لیکچرز کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ نقطہ وار ترتیب کے لئے کام آ سکیں۔ یہ ممکن ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں اگر پاکستان میں دین کے نظام کے لئے کوئی نفاذ کی کوشش ہو تو یہ لیکچرز (علامہ پرویز کے دروس کے ساتھ) نوجوان طبقہ کی تعلیم و تربیت میں کام آئیں۔ انسانی نفسیاتی پہلو کو خاص کر سامنے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ کسی قوم کی حالت اللہ نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی نفسیات میں تبدیلی نہیں لاتی (13:11)۔

اُمید ہے کہ ہماری کوششیں 2023ء میں بھی جاری رہیں گی اور ہم قرآن کی تعلیم سے مزید مستفید ہوں گے۔

میں اس موقع پر چند مزید گزارشات طلوعِ اسلام کے بہن بھائیوں سے شیئر کروں گا جن کا تعلق دین کے نظام کی کوششوں سے ہے۔

1۔ قرآنِ کریم اُن لوگوں سے، جو اللہ کے قانون کی مدد کے طالب ہیں، اپنی ذات کی پختگی کا طالب ہے۔ اس سلسلہ میں وہ مومن اور متقی جیسی اصطلاحات کا ذکر کرتا ہے۔ ان کا معیار قرآن نے مسلسل نوٹ کیا ہے مثلاً (2:177) یہ ہمارا کام ہے کہ ان اقدارِ قرآنی کو اخذ کریں اور پھر دیکھیں کہ اُن پر کیسے عمل کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہمارے اردگرد قارونی / طاغوتی نظام ہے لیکن پھر بھی دو Levels پر ہم کام کر سکتے ہیں۔ پہلے لیول پر ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں یعنی ایمان لانے کے بعد پورے جوش اور توجہ کے ساتھ اس پر غور کریں۔ اس کے ساتھ اعمالِ صالح کرتے رہیں اور طلوعِ اسلام سے منسلک رہیں۔ دوسرے لیول پر اپنی روزمرہ کی زندگی میں دوسروں کو بھی اس کے متعلق بتاتے رہیں اور انفرادی اور اجتماعی طور پر اس کی اقدار کے اندر رہیں۔ مثلاً برائی سے روکنا اور اچھائی کی تعلیم دینا ہم سب کر سکتے ہیں۔ اس طرح اپنی زندگی کے معاملات میں Honesty پر قائم رہیں۔ اپنے قلب و ذہن کی تطہیر بھی ممکن العمل ہے۔ مکافاتِ عمل کو ذہن میں رکھ کر اپنے اردگرد کے حالات کا مطالعہ کریں اور دوسروں کو اس سے متنبہ بھی کرتے رہیں۔

2۔ طلوعِ اسلام چونکہ واحد ادارہ ہے جو کہ دین کو بحیثیت ایک نظام کے پیش کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ سے اس کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے اس ادارہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اس کے سامنے ایک واضح مقصد ہے جو کہ بہت سادہ اور آسان ہے۔ منفی احساسات ہماری ذات پر منفی اثرات چھوڑتے ہیں۔ یہاں پر ہر وقت یہ ذہن میں رکھیں کہ کیا ہمارے پاس کوئی سکالرز / علماء ہیں جو کہ دین کے نظام کے قیام میں مدد دے سکتے ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو پھر کیا میں قرآنِ خالص کا عالم و عامل بن سکتا ہوں؟ اگر ہمیں اس کا جواب ہاں میں ملتا ہے تو پھر آج ہی اس کوشش میں شامل ہو جائیں۔ انسان میں اللہ نے بے پناہ وسعتیں رکھی ہیں۔ یہ وسعتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں جب ہم اِن کو بڑھانے میں لگ جاتے ہیں (2:285)

3۔ دین کے حوالہ سے بھی چند گزارشات پیش کرتا ہوں۔ ہم فرعون کی قوت کو دیکھ کر مادّی اسباب کی طرف جب دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ دین کا نظام کس طرح آئے گا۔ اس کے حالات کیسے سازگار بنیں گے؟ یہاں پر مختصراً آپ سے قرآن کی روشنی میں کچھ شیئر کروں گا۔ اگر ہم دیکھیں تو ہمیں قرآن میں نظر آئے گا کہ اللہ نے انسانی عقلی نظام کا ذکر بھی کیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس نظام کو بدلنے کا طریقہ کار کیا ہے۔ اس کے لئے اُس نے بیج کی مثال دی ہے کہ کس طرح ایک بیج جس میں زندگی مضمر ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ تناور درخت بن جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کی ذات بھی ایک بیج کی طرح ہے۔ جس پر یقین کر کے ہم اُس کے نشوونما پانے کی صلاحیت کو بروئے کار لے آتے

ہیں۔اس کے لئے آیات (35:10) اور (24:55) میں طریقہ کار کو سمجھایا ہے۔ ہمارے کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو ایمان لاکر مومنین بن جاتے ہیں اُن کا کام ہے کہ وہ اکٹھے ہو کر اپنے اختلافات کو دور کر کے ایک جماعت بن جائیں۔ یہ جماعت آہستہ آہستہ کچھ عرصہ کے بعد اس قابل ہو جاتی ہے کہ اس میں دین کے نظام کو لانے اور مضبوط کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لامحالہ اس جماعت کے قیام سے اردگرد کے ماحول میں بھی اثر پیدا ہوگا۔ جو لوگ بھی سنیں گے اور جن کے دل میں خواہش اور تڑپ ہوگی وہ اس جماعت میں شامل ہو کر اپنی ذات کو پرورش اور نشوونما کا موقع دینے کے لئے آگے آئیں گے۔ اس عمل میں کافی لوگ چھوڑ بھی جائیں گے جو کہ سوچیں گے کہ اس طرح قرآن ہمیں نہیں چاہیئے۔ لیکن اس میں بددل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے (2:256)۔ چونکہ صراطِ مستقیم اس دنیا سے اگلی دنیا میں لے کر جاتا ہے اس لئے اس راستہ پر استقامت سے قائم رہنا ضروری ہے۔ لیکن دل اور دماغ کی رضامندی سے ہونا چاہیئے۔

آخر میں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ قرآن ہمیں طریقہ کار بتاتا ہے کہ کس طرح اللہ (کے قانون) کی مدد مل سکتی ہے اور یہ مدد اُس وقت ملے گی جب ہم اُن تمام ذمہ داریوں کو سمجھ لیں جو کہ اللہ نے بحیثیت رب اپنے اوپر لی ہیں۔ یعنی مومنین نے اُن تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے جو کہ اللہ نے قرآن میں بتائی ہیں مثلاً دُنیا میں انصاف قائم کرنا، یتیمی اور مسکینی کا خاتمہ۔ انسان کو انسان کی غلامی سے آزادی۔ انسان کی تکریم بحیثیت انسان کے۔ مساوات تاکہ عورت اور مرد برابر ہوں۔ دُنیا سے بھوک وغیرہ کا خاتمہ۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے یکساں/ ایک جیسے مواقع۔ انسانوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر کوئی پابندی نہ ہو۔ ہر قسم کی منصوبہ بندی مستقل اقدار کی روشنی میں ہو۔ دوسرے الفاظ میں نظامِ ربوبیت کا قیام ہو۔ دین کے نظام میں چونکہ خوف اور حزن باقی نہیں رہتے اس لئے انسانی نفسیات کے حوالہ سے بہت کام کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت آخرت کی زندگی جس طرح قرآن نے بتایا ہے اُس کے متعلق بہت کم علم ہے۔ اختیار و ارادہ کا مطلب ہے کہ دین کے نظام میں ہر فیصلہ کرنے والے پوائنٹ پر ہر ایک کو علم ہونا چاہیئے کہ اُس نے کون سا فیصلہ کس لئے کرنا ہے۔ اس فیصلہ اور انتخاب سے انسان ذمہ دار بنتا ہے اور اچھی زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی سے انسانی ذات آگے بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں اس مختصر نوٹ کو ختم کرتا ہوں۔ شکریہ

تصحیح

گذشتہ شمارہ میں محترم یاسر صدیقی صاحب کے مضمون میں درج ایک قطعہ کے دوسرے مصرعہ میں ایک غلطی رہ گئی تھی، اس لئے اب پورا قطعہ درست کر کے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

کھڑے ہوؤں کو گرا دے نظامِ سرمایہ — گرے ہوؤں کو اٹھانا ہے حکمِ قرآنی
اگر نہ دل ہو بغاوت پہ تیرا آمادہ — کہاں کا دعویٰ ایمان، کیا مسلمانی؟

سہیل شاہین، اٹک

دو انتہاؤں کے درمیان توازن بدوش راستہ

(کنونشن 2022ء کے موقعہ پر پڑھا گیا)

انسان نے ایک نہایت وسیع اور عجیب وغریب کائنات میں آنکھ کھولی ہے۔ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے کچھ پہلوؤں کا اتنی عمدگی سے سمجھ آجانا اور قابلِ فہم ہونا ازخود ایک عجیب بات ہے، پھر جہاں یہ ہمارے احاطۂ شعور سے باہر ہو اس پر شش وپنج کا شکار ہونا تو قدرتی امر ہے۔ لیکن قدرت کو سمجھ پانے میں انسان اب بھی ایک شیر خوار بچہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی ہمیں جو معلوم ہے وہ ایک قطرہ ہے اور جو نہیں معلوم وہ سمندر ہے۔ اور شاید ہمیشہ ایسے ہی رہے۔

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے! انسان کو رازجو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا بے تاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے!

دورِ حاضر میں انسان کے سامنے دو راستے بہت واضح ہوتے ہیں۔ دنیا کی اکثریت آج بھی مذہبی ماحول میں آنکھ کھولتی ہے۔ پھر کچھ لوگ اگر مذہب کو نادانوں کا راستہ سمجھ کر چھوڑ دیں تو مشکل یہ ہے کہ اکثر جو دوسرا راستہ انہیں نظر آتا ہے وہ ہے لادینیت، الحاد، Atheism۔ انسان کو جو راہیں نظر آتی ہیں، اس کی دو انتہائیں ہیں۔ ایک انتہا پر مذہب ہے اور دوسرے پر مادیت پرستی، یہ یقین کہ زندگی بس اتنی ہی ہے جو یہاں ہے، جو نظر آتا ہے۔ ایک انتہا، جہاں مذہب ہے، سوچنا جرم ہے، گناہ ہے۔ غور وفکر پر پابندی ہے۔ تسخیرِ کائنات شجرِ ممنوعہ ہے۔ بس مست رہنا ہے ذکر وفکرِ صبح گاہی میں۔ پختہ تر ہونا ہے مزاجِ خانقاہی میں۔ خدا کو ماننا ہے، یعنی صرف ماننا ہی ہے۔ اور کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھے رہنا ہے۔ انہی سوالوں میں ڈوبے رہنا ہے کہ ۔

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

اگر ہندو ہے تو کلکی (Kalki) کے انتظار میں ہے۔ عیسائی اور یہودی، مسیح اور Jesus وغیرہ کے، بدھ کسی Maitreya کے منتظر ہیں، مسلمان شاید مہدی کے۔ اپنے بل پر کچھ نہیں کرنا، سب آنے والوں پر موقوف ہے۔

چندرسوم، کچھ روایات، جن کا اس دنیا کے سود و زیاں سے کوئی واسطہ نہیں، مذہب کا خاصہ ہیں۔ سب کچھ فرد کی کسی ان دیکھی زندگی یا دوسرے جنموں میں پوتر ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ دنیا میں پوجا پاٹ کے یہ رسمیں کتنی بے نتیجہ ہیں، اس کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ کسی انسان کی زندگی اتنی معنی نہیں رکھتی جتنا ان کے یہ رسوم و رواج۔

ہیں ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

نماز و روزہ و قربانی و حج، یہ سب باقی ہے مسلمان ہی باقی نہیں ہے۔ آج بھی مندروں میں پتھر کی مورتیوں پر دودھ ڈالنے والے بہت ہیں جو پتھروں سے گزر کے گندے نالوں میں بہہ نکلتا ہے۔ مُردوں پر چادریں چڑھانے والے بھی آپ نے کم نہ دیکھے ہوں گے۔ ان کے لیے معنی ہی یہی رکھتا ہے، دل کا سکون اور وہ ملتا ہے خدا کی پرستش سے۔ تماشائے حیات ان کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ عالمِ کردار سے وہ سب بیگانہ ہیں۔ آنکھوں کے سامنے، روزِ روشن کی طرح عیاں حقیقت کو بھی دیکھنے سے قاصر ہیں۔ تمام مذہبی پیشوایان بظاہر تو خدا والے نظر آتے ہیں لیکن لگتا یہی ہے کہ شیطان کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔ تب ہی ابلیس کے مشیر نے کہا کہ:

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

وہ اس دنیا میں کتنے ذلیل و خوار ہیں، کتنے ناکام و نامراد ہیں، اس کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا کیونکہ:

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضائے گردوں ہے بیکرانہ

اس راستے پر عقل کا فقدان تو شاید نہیں لیکن عقل کے استعمال کی شدید کمی ہے۔ پھر آتا ہے عقل پرستوں کا گروہ۔ دوسری انتہا۔ جہاں مذہب سے بیزار شدہ انسان مادیت میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ مادی دنیا کے بارے میں تو خوب جان جاتے ہیں، لیکن حقیقت ان سے بھی دور ہی رہتی ہے۔

محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

ایسے لوگ یہی اخذ کرتے ہیں کہ عقل سے ہی تمام سوالوں کے جواب مل سکتے ہیں۔ پھر وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ خدا ہے یا کہ نہیں ہے۔ چونکہ ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات۔

سائنس انسانیت کے فلاح کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ قرآن بھی ہمیں تسخیرِ کائنات کا حکم دیتا ہے۔ لیکن کائنات کو مسخر کر کے اس کو وحیٔ خداوندی کی بجائے عقل سے استعمال کیا جائے تو مسائل تو پیدا ہوں گے۔ چونکہ

عقل خود بیں، غافل از بہبودِ غیر سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر

اگر مومنین سائنس کا علم حاصل کریں گے تو وہ تسخیر کائنات سے حاصل شدہ علم اپنی عقل کے مطابق نہیں، وحی کے مطابق کام میں لائیں گے۔ لیکن موجودہ سائنس زیادہ تر کمرشلزم کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ پیسہ بڑھانے کے طریقے بنانا، سرمایہ داری

کو تقویت دینا۔ مثلاً آپ سب فیس بک استعمال کرتے ہوں گے۔ فیس بک بنانے والے یہ چاہتے ہیں کہ آپ اسے زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ اس لیے وہ ایسے Algorithms بناتے ہیں کہ آپ کو خبر ہوئے بغیر، آپ اپنے دن رات اس میں کاٹ دیتے ہیں۔ وہ انسان کی نفسیات سے واقف ہیں، اور اس کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ اس سے کتنے نفسیاتی امراض پیدا ہو سکتے ہیں، کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ نہیں، کچھ نہیں، بس ان کو نفع ہونا چاہیے۔ اس بات کو غلط نہ سمجھ لیجیے گا۔ ان چیزوں کے بہت فائدے ہیں۔ ہم طالب علموں کا تو کام ہی نیٹ، یوٹیوب وغیرہ سے چلتا ہے۔ مگر اہم نکتہ یہ ہے، جس پر یہاں روشنی ڈالی جا رہی کہ اس کو انسانیت کے فلاح کے ارادے سے نہیں کیا جاتا۔ ایسا بہت کم ہی کیا جاتا ہوگا۔ اکثر یہ مایۂ خویش بڑھانے کے لیے ہی ہوتا ہے، چاہے انفرادی سطح پر ہو یا قوموں کی سطح پر۔ جس کے نتیجہ میں ہوتا یہ ہے کہ ہمیں سائنس سے نقصانات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ان ملحدین کو جب فطرت کے قوانین کا پتہ چلتا ہے تو ان کے بنانے والے کے بارے میں سوچنے کی بجائے اکثر یہ سوچتے ہیں کہ مذہب کے لوگ کسی مافوق الفطرت طاقت کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان سب کو کنٹرول کرتا ہے، ہم ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ دیکھو! ہم نے ثابت کر دیا کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کو مان کے یہ سب رواں دواں ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے آگے کچھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات سے تو ہم کسی خدا تک نہیں پہنچے، کوئی خدا نظر نہیں آیا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ

ذہن میں جو آ گیا لا انتہا کیونکر ہوا　　　جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

خدا کو صفات سے جانا جا سکتا ہے، ذات سے نہیں۔ انسانی عقل محدود ہے اور خدا لامحدود۔ محدود شے، لامحدود کا احاطہ کیسے کر سکتی ہے! لیکن

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم　　　حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

یہی وجوہات ہیں کہ انسان نے بہت ترقی کر لی ہے۔ دنیا کو گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔ ایک کلک سے ہزاروں کام ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے بنیادی سوالات اور مسائل وہیں کے وہیں ہیں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

قرآن عالم ان کو کہتا ہے جو لوگ صحیفۂ فطرت کے اوراق پر غور و فکر کرتے ہیں جو کہ قوانینِ خداوندی کی زندہ شہادات ہیں۔ یہی لوگ جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبے کا مالک ہے اور جو اس کے مطابق چلتا ہے وہ اسے کس قدر سامانِ حفاظت عطا کرتا ہے۔ اس تعریف کے مطابق روایتی مذہبی پیشوایان جو عرفِ عام میں علماء کہلاتے ہیں، دراصل علماء نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کے بنائے ہوئے اس عظیم سلسلۂ ارض و سماء پر علم و بصیرت سے فکر و تدبر نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے سامنے قوانینِ فطرت کے راز کھلتے ہیں۔ لیکن اسی تعریف کے مطابق ایک مادیت پرست اور ملحد سائنسدان بھی علماء کے زمرہ میں نہیں آ سکتا

ہے۔ جو کائنات کو Self-Contained اور Self-Created سمجھتا ہو، اس پر قوانینِ خداوندی یا مکافاتِ عمل کی ہیبت طاری نہیں ہوسکتی اور نہ ہی وہ کائنات کے اس حسن کارانہ طریقے سے چلنے پر الحمد اللہ پکار اٹھتا ہے۔ تو وہ قرآن کے علماء کی شرط پر کیونکر پورا اتر سکتا ہے۔

آپ سب کو غالباً جیمز جینز اور علامہ مشرقی کے اس واقعے کا علم ہوگا کہ جب علامہ مشرقی نے جیمز جینز سے پوچھا کہ آپ جیسے ماہرِ فلکیات اور سائنسدان کا گرجے میں کیا کام؟ تو انہوں نے کہا کہ جب میں کائنات کی وسعت اور اس میں قائم توازن سے اپنی دھن میں محوِ گردش عظیم کُروں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل بے اختیار خدا کی عظمت کے سامنے جھک جاتا ہے۔ جس پر علامہ مشرقی نے ان کو سورۃ فاطر کی یہی آیت سنائی جس میں علماء کا ذکر ہے۔ جس پر جیمز جینز نے کہا کہ اگر قرآن میں واقعی یہ لکھا ہے تو وہ خدا کا کلام ہی ہے۔ یعنی وہ تسخیرِ کائنات سے ہی خدا تک پہنچا۔

سو قرآن کے مطابق عالم وہی ہوگا جو بینائے کواکب اور دانائے نباتات بھی ہو، فطرت کے قوانین کا ماہر بھی ہو اور ساتھ ساتھ اس علم سے وہ خدا کی بڑھائی کو بھی سمجھ چکا ہو۔ جو قرآن سے بھی واقف ہو، سائنس سے بھی۔ جہاں عقل کا استعمال نہیں یا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی راہ نمائی کے لیے تنہا عقلِ انسانی کافی ہے، وہ صحیح راستے پر نہیں چلتے۔ یہ دونوں انتہا پسند (Extreme) راستے ہیں۔ اس لیے ہمیں ان دونوں انتہاؤں کے راستوں سے توازن کے راستے کی طرف آنا ہے۔ ان سے آگے جانا ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے ، منزل نہیں ہے

اور۔۔۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے قرآن کا راستہ، متوازن راستہ۔ جہاں مذہب کی طرح عقل و خرد کے استعمال پر پابندی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ لیکن جہاں حقیقت صرف اتنی ہی نہیں جتنی عقل کو نظر آتی ہے۔ عقل اور مذہب میں جنگ ہوتی رہتی ہے لیکن قرآن اپنے ہر دعویٰ کو دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور عقل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔ عام خیال کے برعکس ایمان شروع ہی عقل و بصیرت سے ہوتا ہے۔ جو ایمان عقل سے ہو کر دل و جذبات تک پہنچتا ہے وہی صحیح معنوں میں عمل پیدا کرسکتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

قرآن میں بار بار تسخیرِ کائنات کا حکم ہے۔ عقل استعمال نہ کرنے والوں کے لیے وعیدیں ہیں۔ وہ لوگ جہنم کی زندگی گزارتے ہیں جو سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ جن کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ ایسے لوگ انسان نہیں بلکہ حیوان ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

تمام کائناتی قوتیں انسان کے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ انسان ان کو مسخر کر کے اپنے فائدے اور اپنی بقا کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن یہ انسانی زندگی کا منتہیٰ نہیں ہے۔ انسان کے سرکش جذبات نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے صحیح

راستہ یہی ہے کہ انسان اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھے اور عقل سے وحئ خداوندی کی روشنی میں کام لے۔ عقلِ بے باک، انسانی جذبات کی لونڈی بن کر رہ جاتی ہے۔ علم، عقل، فہم، تدبر سب اس بلند مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں جو اقدارِ خداوندی کے مطابق علیٰ وجہ البصیرت زندگی بسر کرنا ہے تا کہ انسانی ذات زندگی کی اگلی بلند ارتقائی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے۔

قرآن کا مقصد انسان کو اپنے مفاد پرستانہ عقل وجذبات کی قید سے باہر نکالنا ہے اور ایسے معاشرے کی تخلیق ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے سے حسنِ عمل اس ارادے سے کرتا ہے کہ یہ نیک عمل وہ اپنی ذات کے ساتھ کر رہا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کی اپنی ذات کا حسن بڑھتا ہے، اس کی اپنی ذات کی نشونما ہوتی ہے۔ ایسا معاشرہ کہ اس دنیا میں بھی کسی کو خوف اور حزن نہ ہو۔ اور اس کی ذات اس قابل بھی ہو جائے کہ مرنے کے بعد زندگی کے اگلے ارتقائی منازل طے کر سکے۔ چونکہ، موت کیا شے ہے، فقط عالمِ معنی کا سفر۔ جہاں تمام انسان برابر ہوں۔ کوئی کسی کا غلام نہ ہو۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔

باقی دونوں راستے قدرے واضح اور آسان ہیں۔ انسان کی عقلِ حیلہ جُو اس سے کہتی ہے کہ یہ راستے آسان ہیں۔ اسے، انہی کو اختیار کرنا چاہیے۔ ان کے مقابلے میں ہم اور آپ نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، وہ بڑا محنت طلب اور صبر آزما راستہ ہے۔ گویا یہ پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا ہے، جس میں قدم قدم پر انسان کی سانس پھول جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں ہر قدم انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس لیے ابلیسی قوتوں کو نہ کسی مذہب سے خطرہ ہے نہ کسی مادیت پرستانہ سوچ سے بلکہ ان کو خطرہ ہے اس دین سے جو قرآن میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابلیس کہتا ہے کہ ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے۔ اور وہ خوفزدہ ہے کہ

الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر ۔۔۔ حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے ۔۔۔ نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف ۔۔۔ منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے اَمیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ۔۔۔ پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ۔۔۔ ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

سو ابلیس یہ چاہتا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب ۔۔۔ یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہمیں اپنا یقین بحال کرنا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس کی طرف ہم نے قدم بڑھانا ہے۔ اقبالؒ نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ۔۔۔ ایں کتابی نیست چیزی دیگر است
چون بجان در رفت جان دیگر شود ۔۔۔ جان چو دیگر شد جهان دیگر شود

صاف کہہ دیتا ہوں جو میرے دل میں چھپا ہے۔ یہ (قرآن) کوئی کتاب نہیں، یہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ جب یہ روح میں سما جاتا ہے تو جان کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ اور جب جان کچھ اور ہو جاتی ہے تو جہان بھی کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

قرآنی ہدایت پر
انسانی ذات کی مقصدیّت کا انحصار

انسانی زندگی کا یہ تصور کہ انسان صرف حیوان کی سطح پر جسم کا نام ہے، یہ بات درست نہیں ہے۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے، جسے اِس کی ذات کہتے ہیں۔ یہ وہ بنیاد ہے، جس پر اسلامی نظریۂ حیات اور اب نظریۂ پاکستان کی بھی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر اسے مان لیا جائے، تو اِس نظریۂ حیات یعنی دین کی بات آگے چلتی ہے۔ اگر اِسے تسلیم نہ کیا جائے، تو دین کے نظریہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے تسلیم کر لینے سے جو بات آگے چلتی ہے، اُس کی رو سے ایمان لانا ہوگا کہ:

الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ (87:2-3)

اُس خدا کے نظام کو قائم کرنے لئے سرگرم رہ جو:

(i) مختلف عناصر میں باہمی امتزاج و ترکیب سے، ہر شے کو تخلیق کر کے ایک ہیئت عطا کرتا ہے؛ (خَلَقَ)

(ii) تخلیق کے بعد، پھر شے کے حشو و زوائد کو دور کر کے، اس میں خاص تناسب اور اعتدال پیدا کرتا ہے؛ (فَسَوّٰی)

(iii) اور وہ شے میں، ایک خاص انداز سے، اور پیمانے کے مطابق، آغاز سے تکمیل تک کی صلاحیّتیں رکھ دیتا ہے (کہ تکمیلی مراحل میں، اور تکمیل کے بعد، اس نے ایسا کچھ ہونا ہے۔ اس کو شے کی تقدیر کہتے ہیں۔ (قَدَّرَ)

(iv) صلاحیّتوں کے بعد، وہ شے کو راستہ دکھا دیتا ہے، جس پر چلنے سے شے اپنی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ (فَهَدٰی)

آغاز سے تکمیل تک زندگی بسر کرنے کی یہ راہ نمائی، ماسوا انسان، ہر شے کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ اسے شے کی فطرت یا جبلّت کہا جاتا ہے، اور جس انتظام کے تحت، شے آغاز سے تکمیل تک پہنچتی ہے، اُس کو خدا کا نظام ربوبیّت کہتے ہیں۔ انسان کو خدا نے اختیار و ارادہ دے کر پیدا کیا تو اس کو زندگی بسر کرنے کے قوانین ودیعت کرنے کی بجائے وحی بذریعہ انبیاء کا طریقہ اختیار کیا۔ تاکہ انسان اپنی اس دنیا کی تکمیلی صورت یعنی مقصد کے حصول میں اپنی ذات کی نشوونما میں کامیاب و کامران ہو مقصد کا حصول انسان کے تخلیقی کردار کا ثمرہ ہوتا ہے، لہٰذا اِس کا یہاں تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

تخلیقی اعمال کرنے اور نہ کرنے دونوں کا ثمرہ:

بنیادی طور پر انسان غور و فکر سے اپنے ارادے پر اختیار رکھتے ہوئے جو عقل و فکر اور علم سے تدبر کرتے ہوئے اعمال کا انتخاب کرتا ہے۔ وہ اُسی کی تخلیق سے منسوب ہوتے ہیں۔ انہی اعمال کو حیوانی اعمال سے نکال کر انسانی اعمال کا درجہ دیا جاتا

ہے جن کی بنا پر انسان جزا و سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس قرآن عقل و فکر سے عاری مجبوری کے عالم میں حیوانی جہنمی زندگی گزارنے والے افراد کا نقشہ یوں کھینچتا ہے کہ:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179)

اور لوگوں کی اکثریت کا یہ عالم ہے، چاہے وہ متمدّن شہری زندگی بسر کرنے والے (انسان) ہوں یا غیر متمدّن دیہاتوں اور جنگلوں میں رہنے والے (جنّ) ہوں، ان کی روش زندگی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ وہ اہل جہنّم میں سے ہیں۔ (ان لوگوں کی نشانیاں یہ ہوتی ہیں کہ) دل رکھنے کے باوجود اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے، ان کی آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، وہ کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ حیوانوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ یہی لوگ ہیں جو اپنی اخروی زندگی سے بے خبر ہیں۔

قرآن نے حیوانی جہنمی زندگی کی پہچان بتائی کہ کان ہوتے ہوئے نہیں سنتے یعنی دعوت پر توجہ نہیں دیتے، دل کے کانوں سے نہیں سنتے۔ آنکھیں ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے یعنی بظاہر تو ایسا لگے کہ وہ متوجہ ہیں لیکن دل اور خیال کہیں اور ہو (7:198)، (10:42-43)، (47:16)۔ اس سے واضح ہوا کہ سننا وہی سننا ہے، جس کے ساتھ عقل شامل ہو، دیکھنا وہی دیکھنا ہے جس میں توجہ موجود ہو۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ بھی ہے کہ تخلیقی اعمال کے عدم سے انسان حیوانوں سے بھی پست کس طرح ہوجاتا ہے؟

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ کیا ایسے انسانوں کی شکل وصورت بدل جاتی ہے؟ بالکل نہیں۔ تو پھر انسان کس طرح حیوانوں سے بھی بدتر ہوجاتے ہیں؟

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (47:12)

''ان کی زندگی حیوانوں کی طرح کھانے پینے کی زندگی ہے'' یعنی حیوانوں کی مانند کھاتے پیتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ انسان کی طبیعی زندگی میں تو تولید ہے، لیکن اس کی ذات کی زندگی میں، تولید نہیں، صرف تخلیق ہی تخلیق ہے۔ افزائشِ نسل یعنی بذریعہ تولید بچے پیدا کرنا، نوعِ انسانی کی بقاء کے لیے ضروری ہے لیکن ذات کا تقاضہ تولید نہیں تخلیق ہے۔

یہاں تین مقامات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(1) صرف تخلیق، (2) صرف تولید اور (3) تولید+تخلیق۔

(1) صرف مقامِ تخلیق:

یہ مقام خداوندی ہے۔ خدا صرف تخلیق کرتا ہے، تولید سے بالکل پاک ہے۔ وہ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ (112:3) ہے یعنی نہ تو اس کی ہستی، تولید کا نتیجہ ہے اور نہ وہ تولید کے ذریعے کچھ پیدا کرتا ہے۔ وہ خالق ہے اور صرف تخلیق کرتا ہے۔ لہٰذا خدا کا مقام، خالقیت ہے، ولدیّت نہیں ہے۔ خدا کے مقام خالقیت میں خدا اشیاء کی تخلیق کے لئے، پہلے سے عدم سے نکالے

ہوئے مسالے کو، مختلف تراکیب وتناسب سے، مختلف فارمولوں سے، جوڑ کر نئی نئی چیزیں بناتا چلا جاتا ہے۔ صفت تخلیق سے پہلے خدا کی دو صفات بدیع اور فاطر، عدم سے مسالہ مہیّا کرتی ہیں، جن کو مختلف تراکیب وتناسب سے جوڑ کر خدا اشیاء بناتا ہے۔ خدا کے موجودہ نظام میں خدا کی تخلیق اس کی صفات بدیع اور فاطر کی رہینِ منّت ہے۔

(2) صرف مقامِ تولید:

یہ مقامِ نباتات وحیوانات ہے۔ خدا کی تخلیق کردہ اشیاء میں جمادات کو تو چھوڑ دیں کہ ان میں زندگی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ، نباتات اور حیوانات ہیں۔ ان میں تولید یعنی Procreation ہے کہ اپنے جیسا پیدا کرتے چلے جانا۔ تولید، نر و مادہ کے جنسی اختلاط کے بعد اپنے جیسے بچے کا پیدا کرنا ہے۔ یہ سلسلۂ تولید نباتات، حیوانات اور انسان کے طبیعی جسم کی پیدائش میں یکساں موجود ہے۔ اس مقام پہ تولید ہوتی ہے، لیکن تخلیق نہیں ہوتی۔ صرف تولید کی حامل اشیاء تخلیق نہیں کر سکتیں۔ مثال کے طور پر نباتات اور حیوانات تخلیق سے نا آشنا ہیں۔ یہ صرف تولید Procreation کر سکتے ہیں، تخلیق نہیں کر سکتے۔ یہ زندگی کی پہلی سطح ہے، جس میں تولید تو ہے، تخلیق نہیں ہے۔ بکری اور شیر نہ تو مومن ہوتے ہیں اور نہ کافر۔ یہ کھاتے پیتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، ان کی پرورش کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں، یہاں تخلیق نہیں ہے۔

اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہی ہے جو حیوانات سے متعلق ہے یعنی انسان کی طبیعی زندگی، جس میں عالمِ آفاق کا بدیہی طور پر وہی قانون کارفرما ہے، جو عام حیوانات میں جاری وساری ہے۔ حیوانات ہی کی طرح اس کی زندگی کا دارومدار بھی، ہوا، اور غذا پر ہے نیز سونا اور جاگنا بھی اسی طرح ہے۔ اس کے جسم کی مشینری بھی حیوانات کی مشینری کی طرح ہی چلتی ہے۔ اسی قانون کے ماتحت اس کا جسم زندہ رہتا ہے اور اسی کے مطابق جسم مر جاتا ہے۔ لہٰذا، جس قدر معاملات اس کے طبیعی زندگی سے متعلق ہیں، وہ اس کی انسانی زندگی کے نہیں بلکہ حیوانی زندگی کا حصہ ہیں، اور عالمِ آفاق کے قانون کے ماتحت آتے ہیں۔

(3) مقامِ تولید+تخلیق:

یہ مقام انسانیّت ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی تو وہی حیوانی زندگی ہے، اس لئے نر و مادہ کے اختلاط سے، یہ اپنے جیسے جسم ہی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی، طبیعی قوانین کے تابع ہے یعنی زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا، سانس لینا، روشنی، گرمی وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ طبیعی قوانین کی خلاف ورزی سے انسان بیمار ہوتا ہے اور علاج کرانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آخر کار اس کی جسمانی مشین بند ہو جاتی ہے اور یہ مر جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی طبیعی زندگی وہی ہے جو ایک حیوان کی ہے، لیکن انسان محض اس کے جسم کا نام نہیں ہے۔ یہ عبارت ہے اس کے طبیعی جسم کی زندگی اور اس کی غیر طبیعی ذات کی زندگی سے۔ غیر طبیعی ذات کو خدا نے اختیار وارادہ اور فوأد عطا کیے ہیں۔ انسانی ذات کا انسانی جسم کے اندر ٹھکانہ کہاں ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے اور نہ معلوم ہو سکتا ہے۔

انسان کی زندگی میں تولید ہی تولید رہے اور خدا کی صفت تخلیق نہ آئے تو یہ مادہ پرستی کی زندگی ہے۔ انسانی ذات کی زندگی کی تکمیل کا ذریعہ تولید کرنا نہیں ہے بلکہ تخلیق کرنا ہے۔ تولید تو انسان کی طبیعی نسل کی بقاء کے لئے ضروری ہے۔

ذات کی نشوونما، یا اس کی تکمیل، تخلیق کرنے سے ہوتی ہے۔ روپیہ پیسہ جمع کرنا، کاروبار کرنا سب تولید میں آجاتا ہے کہ آپ اپنے اور بچوں کے لئے مادی اسباب جمع کرتے ہیں۔ انسان کو ذات عطا ہو جانے کے بعد مقصدِ حیات تولیدی زندگی سے بلند ہے یعنی تخلیقی زندگی ہے۔ تخلیق کے لئے آرزو، مدعا، مقصد سامنے ہونا چاہیے۔ حیوانی زندگی میں آرزو اور مقصد نہیں ہوتا، محض طبیعی زندگی ہوتی ہے اور یہ طبیعی قوانین کے تابع گزرتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے اندر سے آرزو، مدعا اور مقصد کا ابھرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد تخلیق کرنا ہے تاکہ اس کی ذات کی زندگی کی نشوونما ہو سکے۔ جو شخص اپنے تخلیقی کارناموں سے اپنی ذات کی نشوونما نہیں کر سکتا وہ اپنے مقصدِ حیات میں ناکام ٹھہرتا ہے۔ یہ جو ہماری مادی زندگی یا تولیدی زندگی کا مقصد ہے، تو یہ ہمارا تخلیق کیا ہوا نہیں ہے، ہم نے کہیں بیٹھ کر، سوچ بچار کر کے کسی کارخانے میں نہیں بنایا کہ ہم کھانا کھانے، پانی پینے اور سانس لینے سے زندہ رہیں گے۔ یہ خدا کا تخلیق کردہ ہے۔ جس شخص میں قوتِ تخلیق نہیں اسے علامہ اقبالؒ نے کافروزندیق کہا ہے، اس کی زندگی کو تولیدی، مادی اور تکراری کہا ہے۔

یہ شرفِ انسانیت، انسانی ذات تک ہی محدود ہے۔ ہم نے دیکھا کہ:

(1) جہاں تولید نہیں، صرف تخلیق ہے وہ تو مقامِ خداوندی ہے۔

(2) جہاں صرف تولید ہے، تخلیق نہیں ہے، وہ مقامِ حیوانات و نباتات ہے۔

(3) جہاں تولید کے ساتھ تخلیق بھی ہے وہ مقامِ انسانیّت ہے۔

انسانی ذات کی انفرادیت لئے ہوئے جوابدہی کا قرآنی اصول

قرآن ایک انسان کو، ایک فرد کو، بلکہ ہر ایک فرد کو الگ الگ Individuality یا انفرادیت کا حامل سمجھتا ہے۔ فردًا کا ترجمہ انفرادیت ہے، جسے انسانی ذات یا اس کی Personality کہا جاتا ہے۔ اچھے بُرے اعمال کے، اچھے بُرے نقوش انسانی ذات پر مرتب ہوتے ہیں۔ انسان تنہا پیدا ہوتا ہے اور کسی سابقہ جنم یا کسی دوسرے شخص کے گناہوں کے اثرات لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سادہ سلیٹ لے کر آتا ہے۔ اسی طرح اس کے اعمال کی سزا بھگتنے میں بھی نہ کوئی دوسرا شریک ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اس کی مصیبت یا سزا کو بانٹ سکتا ہے۔ اپنے اعمال کی سزا خود بھگتنا انسانی ذات کی انفرادیت ہے۔

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (19:95) یہ سارے کے سارے قیامت میں اکیلے پیش ہونے والے ہیں۔

انسانی ذات وہ ہے، جسے انسان ''میں'' کہہ کر پکارتا ہے۔ باقی تمام اشیاء کو ''میری'' یہاں تک اپنے رب کو بھی ''میرا رب'' کہہ کر پکارتا ہے۔ موت کے بعد صرف ''میں'' آگے جاتی ہے۔

اِس کی قرآن سے بھی وضاحت ملتی ہے کہ: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ (6:94) یقیناً تم ہمارے پاس اس طرح انفرادیت لئے ہوئے آتے ہو جس طرح ہم نے پہلی دفعہ منفرد حیثیت میں تمہیں پیدا کیا تھا۔

اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا، اُس کو پیچھے ہی چھوڑ آئے۔ یقینی طور پر تم ہمارے پاس اسی انفرادیت کو لئے ہوئے آتے

ہو، جس طرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ منفرد حیثیت سے پیدا کیا تھا۔ مَیں کے علاوہ وہ مادی اشیاء جسے وہ ''میری'' یا ''میرا'' کہتا تھا، سب پیچھے رہ جاتی ہیں۔ انسانی ذات کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ اس کے تمام اعمال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ انسان کے تمام مادی لوازمات و نسبتیں یہاں رہ جاتی ہیں، جبکہ اس کی ذات پر مرتّب اچھے یا برے اعمال کے نقوش، جو کہ غیر مادی ہوتے ہیں، وہ ذات کے ساتھ آگے جائیں گے۔ انسان کو دنیا میں آکر کچھ بننا ہوتا ہے۔ انسان کو کچھ بننے کے لئے، مادی اشیاء یعنی اسباب و ذرائع ''کچھ بنانے'' میں مددگار ہوتے ہیں، مگر وہ مادی ذرائع مقصود بالذّات نہیں ہوتے۔ مقصود بالذّات ہے ''انسان کا کچھ بننا''۔ انسان کو جو کچھ بننا چاہئے، اس کے لئے خدا نے قرآنی راہ نمائی عطا فرمادی ہے تاکہ انسان، وہ کچھ بن جائے، جو خدا اسے بنانا چاہتا ہے، اور یہ وہ کچھ بن جائے۔ جو قرآنی راہ نمائی سے دور رہے گا یا فاصلے پر رہے گا تو وہ، وہ کچھ نہ بن سکے گا، جو قرآن اس کو بنانا چاہتا ہے اور جو کچھ قرآن بنانا چاہتا ہے وہی انسان کے لئے مقصود بالذّات ہے۔ سامان زیست To have ہے، اور جو کچھ اس کو بننا ہے وہ To be ہے۔ قانون مکافات کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کے نتائج سے خود متأثر ہوتا ہے۔ اس سے نفس کی یکتائی Uniqueness ثابت ہوتی ہے۔ اس میں نہ آپ اپنے عمل کا کوئی حصہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں، اور نہ کسی دوسرے کے عمل کا اثر آپ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔

انسانی ذات کی بنیاد میں قانونِ مکافاتِ عمل کی اہمیت:

انسانی زندگی محض طبیعی یا حیوانی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے، جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی ہے تو طبیعی زندگی ہے، لیکن چونکہ یہ مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے اس لئے اس کی زندگی انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ یعنی اس نے معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں، جن سے معاشرہ کے مختلف افراد میں ٹکراؤ نہ ہو اور سب امن چین اور خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد کے لئے سوسائٹی کچھ قوانین و ضوابط مرتب کرتی ہے، جن کی پابندی سب افراد کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ جو اِن قوانین کو توڑتا ہے، معاشرہ اِسے مجرم قرار دے کر، قانون شکنی کی سزا دیتا ہے۔ اسے معاشرہ کا نظامِ عدل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی درحقیقت قانونِ مکافاتِ عمل ہی کی ایک شکل ہے لیکن معاشرے کے قانون میں اور طبیعی قانون میں کچھ فرق ہے، اور وہ فرق بڑا اہم ہے۔ معاشرہ کے نظام عدل کی رو سے ہو سکتا ہے کہ

1۔ ایک شخص قانون شکنی کرے، لیکن نظامِ عدل کی گرفت میں نہ آئے۔

2۔ گرفت میں آئے بھی، تو کسی نہ کسی طرح اپنے جُرم کی سزا سے بچ جائے۔ رشوت سے، سفارش سے، یا فریب دہی وغیرہ سے۔

3۔ جو شخص اِس طرح قانون شکنی کی سزا سے محفوظ رہ جائے، اس میں اور اُس شخص میں جس نے قانون شکنی نہیں کی تھی، کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں سوسائٹی کی نگاہ میں یکساں ''مملکت کے پُرامن شہری'' ہوتے ہیں۔

4۔ جب معاشرہ میں قانون شکنی عام ہو جائے، تو قانون شکن اِن لوگوں کے مقابلہ میں، جو قانون کی پابندی کرتے ہیں زیادہ مزے میں رہتے ہیں کیونکہ یہ جائز اور ناجائز ہر طریق سے مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔

خواجہ ازہر عباس، کراچی

انتخابات اور قرآن

سارے قرآن کریم میں خطاب یَاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے الفاظ سے آتا ہے۔ یعنی قرآنِ کریم مومنین سے بہ حیثیت ایک جماعت کے خطاب کرتا ہے، وہ انسانوں سے فرداً فرداً خطاب نہیں کرتا۔ قرآن کریم میں جو دعائیں بھی آتی ہیں وہ بھی سب اجتماعی ہیں، وہ انفرادی نہیں ہیں۔ وہ ایک ایسی قوم تیار کرتا ہے جو دین کے نظام کو قائم کرتی ہے۔ جس میں قوانین خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کے نظامِ حکومت کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔ وہ دائرہ صرف سیاسی امور اور حکومت کی مشینری تک محدود ہوتا ہے۔ جیسا کہ جمہوریت کا تصور ہے۔ جمہوریت کا دائرہ صرف نظامِ مملکت تک وسیع ہوتا ہے۔ جمہوریت کا تعلق فلسفہ حیات یا کسی قوم کے بنیادی نظریات سے نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں 65 سال سے جمہوریت جاری ہے جس کا دائرہ حکومت کی مشینری تک محدود ہے ہندوستان کی تہذیب و کلچر اور اُن کا فلسفہ حیات جمہوری نہیں ہے۔ ان کے ہاں جمہوریت کے باوجود ایک برہمن کو جو عزت، حقوق و مراعات حاصل ہیں وہ ایک شودر کو حاصل نہیں ہیں۔ اسلام کا نظام اجتماعی انسانی زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے اصول و قوانین کا نفاذ، معاشی، معاشرتی، تمدنی عائلی، قانونی، تمام شعبہ ہائے حیات میں ہوتا ہے۔ ان تمام شعبہ ہائے حیات کے ٹھیٹ دنیاوی معاملات میں سے بھی جس معاملہ کا فیصلہ وحی کی رو سے کر دیا جائے، یا جو کام بھی وحی کے مطابق سرانجام دے دیا جائے، وہ دینی بن جاتا ہے۔ مرد وعورت کے جنسی تعلقات بالکل حرام ہیں۔ لیکن جب ان تعلقات کو وحی کی رُو سے نکاح کی قید میں لے آیا جاتا ہے تو وہ دینی کام بن جاتا ہے۔ سیکولر حکومت کو جب اسلامی نظام میں تبدیل کر دیا جائے، تو اس اسلامی نظام کو قائم رکھنے اور اس کو چلانے کے لئے جو امور بھی سرانجام دیئے جائیں، وہ سب دینی کام ہوتے ہیں۔ اور قرآن کریم ان کے کاموں کو اعمال صالحہ کہتا ہے۔ ہر وہ کام جس سے اسلامی نظام کو تقویت ملتی ہے عمل صالح ہے۔ اِس مملکت کو چلانے والوں کو منتخب کرنا بھی ایک دینی کام ہے۔ اور اگر آپ نے کسی عہدہ کے لئے اس کے اہل اور اس کے مستحق شخص کو منتخب کر لیا تو یہ عمل صالح ہے۔ قرآنی نظام کے تمام باشندوں کا تزکیہ نفس از خود ہوتا چلتا ہے۔ یعنی اِس نظام کے تمام انسانوں کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، اور انسان کی ساری خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اس معاشرہ کے تمام شہری اپنی اپنی صلاحیتوں کو اجتماعی نظام کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ وہ نظام ان کی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں کے لئے خرچ کرے۔ اِس کے شہری تو اپنی صلاحیتیں نظام کے سپرد کرتے ہیں، اور یہ نظام

ان کی صلاحیتوں کو مزید پروان چڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

سب سے پہلے اس قسم کا معاشرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل دیا تھا۔ کیونکہ اس طرح کا معاشرہ تشکیل دینا آپ کے فرائض میں شامل تھا (5:48; 38:26; 42:13; 4:65)۔ حضورؐ کے بعد چونکہ یہ امت مسلمہ کتاب خداوندی کی وارث قرار پائی ہے (35:32) ۔ اس لئے اب اسی اُمت مسلمہ پر اسی طرح کا نظام قائم کرنا فرض ہے۔ لیکن اسلام کا نظام قائم کرنا بڑا مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ انبیاء کرام کی اپنی شخصیت' انسانیت کی معراج کبریٰ پر فائز ہوتی تھی۔ اُن کی فراست' ان کا ایثار و خلوص' ان کی شخصیت کو مزید پرکشش بنا دیتا تھا۔ انسانیت کا دکھ و درد ہر وقت ان کو ملول و مغموم رکھتا تھا۔ وہ رات دن اسی اُدھیڑ بن میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح دین کا نظام قائم کر کے یہ انسانیت کے درد و غم کو ختم کر دیں۔ اپنی شخصیت کی ان صلاحیتوں کے زور پر وہ نظام قائم کر دیتے تھے' اس کے برخلاف اس موجودہ دور کے قائدین اور لیڈر جن کے ذمہ ایسا معاشرہ قائم کرنا ہوتا ہے' ان کے پیش نظر تو صرف ان کا ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ طاغوتی معاشروں میں قوم کا سب سے زیادہ بدکردار طبقہ قوم کا لیڈر بنتا ہے۔ اگرچہ وہ ہر وقت یہی اعلان کرتے رہتے ہیں کہ وہ غریبوں کے ہمدرد اور غم گسار ہیں' لیکن عملاً وہ قوم کی جس قدر دولت ہوتی ہے وہ اسے لوٹتے چلے جاتے ہیں۔ لیڈروں کا یہ حال تقریباً سب ممالک میں ایک جیسا ہی ہے۔ البتہ حالات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ کمی زیادتی ہو سکتی ہے۔ قرآنِ کریم ایک استحصالی معاشرہ کو قائم کرنے سے روکنے' اور دین کا نظام قائم کرنے کے لئے مستحق اور اہل لوگوں کو آگے لانے پر اصرار کرتا ہے۔ اچھے لوگوں کو با اختیار بنانے کے بعد ہی اچھا معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

پہلی اہم بات لیڈروں اور قائدین کا انتخاب کرنے کا مرحلہ ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (36:21) ان لوگوں کا اتباع کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے' اور وہ خود راہ راست پر ہیں' قرآن کریم نے لیڈر کے لئے چند شرائط عائد کی ہیں' پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ لیڈر کسی قسم کا بدلہ یا صلہ طلب نہ کرے' اس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ ہو۔ ہر قسم کی اغراض و لالچ سے بالاتر ہو کر محض انسانیت کی خدمت کے لئے سارے مصائب برداشت کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ لیڈر خود بھی ہدایت یافتہ ہو۔ ہدایت یافتہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ قیادت کی صلاحیت رکھتا ہو' قوم کے مفادات کی حفاظت کرتا ہو' اس کے دُکھ درد میں شریک ہو۔ یہ نہ ہو کہ قوم تو ایک ایک پیسہ کو ترستی ہو' اور وہ اپنے لئے نئے محل تیار کر رہا ہو' اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا رہے' تیسری خصوصیت قرآنِ کریم نے لیڈر کی یہ بیان فرمائی کہ وہ یہ کہے وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (36:22) وہ صرف اللہ تعالیٰ کی محکومیت اختیار کرتا ہے کیونکہ اس کے عمل کا ہر قدم اللہ کی عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو حاکم تسلیم نہیں کرتا قرآن اسلامی مملکت کے قائدین کے لئے یہ چند خصوصیات خود بخود فرماتا ہے۔

قرآن کریم کے مطابق اسلامی مملکت چلانے کی ذمہ داری میں پوری امت شامل ہوتی ہے ((24:55۔ اِس مملکت

کے ہر باشندہ کا فرض ہے کہ اس نظام کو چلانے کے لئے بہترین لوگوں کا انتخاب کرے، اورصرف ان لوگوں کو آگے لائے جو اس کے اہل ہیں۔ اس مملکت میں ووٹ دینا ہر شخص پرفرض ہے ووٹ دینے کے لئے اپنا اختیار دوسروں کے سپرد کرنا ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دے کر اس بات کو فرض کیا جا رہا ہے کہ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا (4:58) حکومت چلانے اور عدل کے مطابق فیصلہ کرنے کے اختیارات ان کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہیں۔ عام طور پر مفسرین کرام نے اس جگہ امانت کا مفہوم ودیعت ہی لیا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر آپ کے پاس کسی شخص نے ایک رقم امانتاً رکھی ہے تو آپ اس رقم کو عندالطلب اس شخص کو واپس کر دیں۔ لیکن یہاں یہ لفظ اس معنے میں استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ آیہ کریمہ کے اگلے حصہ نے اس کا مفہوم واضح کر دیا ہے جبکہ ارشاد ہوا ہے کہ وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ (4:58)۔ (ترجمہ) جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔ آیت کے اِس حصہ سے خوب واضح ہو گیا کہ یہاں امانت سے مراد وہ اختیارات ہیں جن کے ذریعے عدل کے ساتھ فیصلہ ہوسکتا ہو مشہور عربی لغت ''مصباح اللغات'' نے بھی امانت کا ترجمہ فریضۂ خداوندی کیا ہے۔ حضرت شیخ الھند کے ترجمہ کے حواشی پر مرقوم ہے ''یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ادائے امانت اور عدل کے موافق حکم دینے کا حکم فرماتا ہے، تمہارے لئے سراسر مفید ہے''۔ اس کے بعد حاشیہ کی اگلی شق میں فرمایا ''پہلی آیت میں حکام کو عدل کا حکم فرما کر اب اوروں کو حکام کی متابعت کا حکم دیا جاتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حکام کی اطاعت جبھی واجب ہوگی، جب وہ حق کی اطاعت کریں گے''۔ حاشیہ کے ان نوٹس میں امانت اور عدل کو ساتھ ساتھ بیان کر کے واضح کر دیا کہ یہاں امانت سے مراد حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کے اختیارات ہیں''

اِس مقام پر امانت کا لفظ استعمال کر کے قرآن کریم نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ عمال وحکام کے یہ سارے اختیارات اُن کے ذاتی نہیں ہیں۔ یہ ان کے پاس امانات ہیں جو شہریوں نے ان کے سپرد کی ہیں۔ یہ اختیار ہر شخص کو حاصل تھا، لیکن اگر انفرادی طور پر ہر شخص ان کو استعمال کرنے لگے تو ملک میں انارکی پھیل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ تو اس قاتل کی سزا خود اس کو قتل کرنا ہے۔ اب اگر مقتول کے وارث خود اس قاتل کو قتل کر دیں تو یہ پھر ایک جرم سرزد ہوگا، اور اس سے ملک میں لاقانونیت پھیلے گی۔ اس لئے تمام شہری مل کر اپنے اپنے اختیارات حکومت کو دے دیتے ہیں کہ وہ حکومت اس قاتل سے بدلہ لے اور مقتول کے وارثین مطمئن ہو جاتے ہیں کہ حکومت خود اس کا بدلہ لے لیگی۔ اس اختیار کو حکومت کے سپرد کر دینا ہی ادائے امانت ہے جس کو اس کے اہل کو سپرد کرنا ضروری ہے۔ اور اہل سے مراد وہ شخص ہے کہ جو قتل کا صحیح صحیح بدلہ لے، نہ تو تساہل کرے اور نہ ہی رشوت لیکر اس قاتل کو چھوڑ دے۔

قرآنی نظام میں حاکم ورعایا کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ اِس نظام کے ذریعے اللہ سبحانہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے ہیں ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کو پورا کرانے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں، جو لوگ وعدے پورے کرانے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں۔ ان کے لئے فرمایا وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَعَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ (23:8) (ترجمہ) اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار سے بخوبی واقف ہیں۔ اس مقام پر امانت کا مفہوم نکھر کے سامنے آ رہا ہے۔ اس

آ یہ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ مملکت کے شہری اپنے سارے اختیارات مملکت کے سپرد کر دیتے ہیں اور مملکت خداوندی ان سے کئے گئے وعدوں کو پورا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تمام مخلوق کے رزق کی ذمہ داری اس پر ہے (11:6) اِس مملکت کے سارے شہری زراعت اور کھیتی باڑی کر کے، مملکت کے لئے اناج مہیا کرتے ہیں، زمین کے لگان کی رقم ادا کرتے ہیں، اور اس رقم و اناج کو خرچ کرنے کی امانت یعنی ذمہ داری ان کے سپرد کر دیتے ہیں۔ مملکت کا یہ عہد ہے کہ وہ ہر شہری کو رزق فراہم کرے گی۔ مملکت کے لئے یہ فرض ہے کہ وہ یہ عہد پورا کرے۔ حضرت عمر کا یہ قول ہے کہ دجلہ کے کنارے اگر کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا، تو مجھ سے اِس کا مواخذہ ہوگا، یہ انہوں نے اپنے اوپر خدا کی وہ ذمہ داری لی تھی جو اسلامی مملکت پوری کرتی ہے۔ یہ لوگ وہ ذمہ داری پوری کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو ایک یہودی ملا جو چند روز پیشتر سے ان کی حکومت میں آیا ہوا تھا۔ اس نے جب مملکت کے واجبات ادا کرنے چاہے تو حضرت عمر نے اس کو ان کی ادائیگی سے منع فرما دیا اور فرمایا کہ چونکہ تم اس مملکت میں بالکل نو وارد ہو، اور مملکت نے تمہارے لئے کوئی کام بھی نہیں کیا ہے، اس لئے مملکت کو تم سے کچھ بھی لینے کا استحقاق نہیں ہے۔ اور فرمایا کہ پہلے اس مملکت میں سال بھر رہو، جب مملکت تم سے اپنا کوئی عہد پورا کر دے تو پھر اس کے بعد تم مملکت کے واجبات ادا کرنا۔ اسلامی مملکت اپنے سارے عہد اپنے باشندوں سے پورے کرتی ہے اور اگر یہ مملکت اپنے عہد پورے کرنے میں ناکام رہے، تو اِس مملکت کی اطاعت اس کے باشندوں سے مرفوع ہو جاتی ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے امانات بصیغہ جمع استعمال کیا ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ یہ مالی امانت نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے اختیارات کے لئے امانات کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس سے یہ بات بھی واضح کرنی مقصود ہے کہ امانات کے بارے میں امانت سونپنے والے کی طرف سے ایک دن اس کی پُرسش بھی ہوگی۔ اگر ان امانتوں میں خیانت ہوگی تو خدا کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ آ یہ کریمہ کا ایک حصہ واذا حکمتہ بین الناس، اس امانت کے اہم ترین پہلو کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اور امانت کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے۔ اس کی بھی وضاحت کرتا ہے۔ یعنی مقدمات کے فیصلوں میں جب انسان برابر ہیں۔ اس جگہ بین الناس فرمایا ہے۔ بین المسلمین یا بین المومنین نہیں کہا۔ ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اِس حکم میں تمام انسان شامل ہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی ہی شانِ بلند و عالی اور مرتبہ عظیم ہے، اور اس کا یہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے کہ وہ کس طرح ساری انسانیت پر لطف و کرم کرتا چلا جاتا ہے، اور کسی ایک شخص کو بھی عدل سے محروم نہیں رکھتا۔ امانت کا لفظ استعمال کرنے سے یہ بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی مملکت کے عہدوں کو امانت قرار دے کر یہ بھی واضح کر دیا کہ جس طرح امانت صرف اس کو دی جاتی ہے جو اس کا مالک ہے۔ اور کسی کی امانت رحم کھا کر کسی غریب آدمی یا رشتہ دار کو نہیں دی جا سکتی۔ اگر کسی شخص کے دس ہزار روپے میرے پاس بطور امانت کے رکھے ہیں تو میں یہ امانت اس شخص کو ہی عند الطلب واپس لوٹانے کا پابند ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کسی غریب آدمی پر رحم کھا کر یہ دس ہزار روپے اس کو دے دوں یا یہ رقم اپنے کسی رشتہ دار کو خوش کرنے یا اس کی مدد کرنے کے لئے دے دوں۔ بالکل اسی طرح اسلامی مملکت کے عہدے بھی کسی رشتہ دار یا کسی دوست کو نہیں دیئے جا سکتے۔ کیونکہ یہ بھی امانتیں ہیں۔ اور ان امانتوں کے مستحق صرف وہ لوگ

ہیں جو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی وجہ سے اس کے اہل ہوں۔ اسلامی مملکت کے اِن عہدوں کو ہر صوبہ میں کوٹوں کے مطابق تقسیم کرنا بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ اسی طرح کا بٹوارہ صرف سیاسی وجوہات پر ہوتا ہے اور اِس طرح ناکارہ اور نااہل لوگوں کو بھی بڑے بڑے عہدے بطور رشوت مل سکتے ہیں۔ یہ عہدے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی امانتیں ہیں جو صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہیں جو اس کام کے اہل ہوں۔

سیکولر حکومت اور اس حکومت کے افسران کی اطاعت فرض نہیں ہوتی۔ اُن کے ہاں اِس کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن اِسلامی مملکت کی اطاعت اور اس کے افسران کی اطاعت فرض ہوتی ہے (4:59) ان افسران کی اطاعت سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ ان افسران کی نافرمانی کرنے سے گناہ ہوتا ہے اس لئے اِس مملکت میں افسران کے انتخاب میں حد درجہ احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔

سورہ نساء کی جس آیہ کریمہ سے اِس مضمون کو شروع کیا گیا ہے (4:58) اِس آیت میں مملکت کے عام باشندوں کو حکم تھا کہ انتخاب کے دوران ووٹ (Vote) صرف اِس کو دو جو اِس ووٹ کا اہل ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اب اس آیت میں اس مملکت کے افسران کو حکم دیا جارہا ہے یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (8:27) اے ایمان والو تم نہ تو اس اسلامی نظام (اللہ و رسول) سے خیانت کرو اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ آیت سورۂ نساء کی آیت کے بالکل مقابل آئی ہے۔ جس بات کا مطالبہ اُس آیت میں کیا گیا تھا' اس کی ضد سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔ خدا اور سول سے خیانت یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے فوجی یا سول (Civil) راز دوسروں تک پہنچائے جائیں۔ یا اسلامی مملکت سے کسی قسم کی بھی غداری اللہ و رسول سے خیانت ہے اور تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ سے مراد اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا نہ کرنا ہے۔ جو افسر اپنے عہدے کے تمام فرائض پوری طرح ادا نہیں کرتا' وہ اسلامی حکومت (اللہ و رسول سے خیانت کرتا ہے۔

یہاں تک یہ بیان کیا گیا ہے کہ صرف مستحق افراد کو ووٹ دینا چاہئے۔ اِس کے بعد خدمت عالی میں یہ گذارش کی جاتی ہے کہ اگر آپ نے کسی غیر مستحق فرد کو ووٹ دیا اور وہ کسی عہدہ پر فائز ہونے کے بعد اس عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھائے یا رشوت کا بازار گرم کرے' ملک میں سازش کا جال پھیلاتا پھرے' ملک میں فساد پھیلانے کا مرتکب ہو' تو اس کی ان تمام غلط کاریوں میں آپ برابر کے شریک ہیں۔ قرآنِ کریم ارشاد فرماتا ہے مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّکُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا (4:85) (ترجمہ) جو شخص برے کام کی تحریک کرے' اس میں اس کا حصہ ہوگا۔ ہاں اگر آپ ایسے شخص کو ووٹ دیں جو ملک میں اصلاح کرے اور ملک میں ترقی و مرفہ الحالی کا باعث بنے' تو آپ اس کی نیکیوں میں شریک ہوں گے۔ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّکُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (4:85) (ترجمہ) اور جو اچھے کام کے لئے آمادہ کرے گا' تو اس میں سے اسے بھی حصہ ملے گا۔ اِس لئے آپ کا فرض ہے کہ آپ ہمیشہ بہترین لوگوں کو منتخب کر کے آگے لائیں تا کہ ملک کا نظم وضبط برقرار رہے اور ملک ترقی کر کے مرفہ الحال ہو۔ ملک میں خوش حالی آئے۔ تعلیم کا معیار بلند ہو' اور لوگوں کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوں۔

ڈاکٹر سنبل، اسلام آباد

ارتقاء

(ایک تخیل، ایک حقیقت)

قرآن اور سائنس کی روشنی میں

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (7:54) قرآنِ کریم میں دو جہانوں کا ذکر ہے ایک عالمِ امر جو خالصتاً ذاتِ باری تعالیٰ سے متعلق ہے جس کی نسبت سے اللہ سبحانہ اپنے آپ کو فاطر، فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:14) اور بدیع ،بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:102) کہتے ہیں یعنی عدم Nothingness سے وجود بخشنے والا اور دوسرا جہاں، عالمِ خلق جس کی نسبت سے اللہ تعالیٰ خالق (الفرقان:59،عنکبوت:44) کہلاتے ہیں۔

عالمِ امر یا عالمِ بالا کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ نہیں ہیں جو کچھ ہے وہ قرآنِ پاک سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ یہاں اللہ پاک کا ارادہ کام کرتا ہے یعنی اس جہان میں اس کا امر کارفرما ہوتا ہے۔ عالمِ بالا میں ذاتِ باری تعالیٰ صحیح معنی میں قادرِ مطلق ہے۔ یہاں وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے (یفعل ما یرید) یہاں جو کچھ ہوتا ہے۔ جس طرح ہوتا ہے وہ ہماری محدود عقل کے دائرے میں نہیں آتا۔ یہی عرش ہے اور یہی کرسی (11:7)

لازماں: Spaceless Time

لامکاں Timeless Space

دوسرا جہاں ''عالمِ خلق'' ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے آج تک عمل تخلیق جاری ہے۔ موجود مواد سے کچھ نیا بنانا ہی تخلیق ہے۔ اس لحاظ سے انسان بھی خالق ہے کہ اس نے سینکڑوں پھل' سبزیاں رنگ برنگے پھول، جانور حتیٰ کہ انسان (Cloning) بھی تخلیق کئے۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ''احسن الخالقین'' ہے (مومنون:14) اور اپنی تخلیقات میں نیا نئے اضافہ کرتا رہتا ہے يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1)

جب یہ جہان رنگ وبو معرضِ وجود میں آیا تو اس کے قائدے اور قوانین بھی وضع ہوئے۔ اس جہان کا سارا نظام انہی قواعد وقوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہے۔ یہ قوانین نہ معطل کئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی تبدیل ہوتے ہیں حتیٰ کہ اللہ جل جلالہٗ بھی ان قوانین کو نہیں توڑتے۔

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (3:39)

بنیادی طور پر یہ قوانین دو طرح ہوتے ہیں ایک انسانی زندگی سے متعلق (جن کو قرآن نے تفصیلاً بیان کیا ہے) اور دوسرا خارجی دنیا سے متعلق (جن کو قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے)۔

خارجی دنیا کے متعلق ان قوانین کو قوانینِ فطرت کہتے ہیں(Laws of Nature) جو غیر متبدل اور اٹل ہیں(30:30) جب یہ فارمولا شکل میں ہوں تو قرآن انہیں کلمۃ اللہ کہتا ہے اور جب یہ عملی شکل اختیار کریں تو ''سنت اللہ'' کہلاتے ہیں۔

خارجی دنیا کے ان قوانین کو دریافت کرنا اور ان سے متعلق قوتوں کو قابو کرنا ہی تسخیرِ کائنات ہے جو کہ مومن کا فریضہ ہے۔ انسان بہت سی قوتیں (ملائکہ) زیرِنگیں کر چکا اور اس نے انہیں اپنی خدمت میں لگا رکھا ہے مومن کا کام ہے کہ ان قوتوں کو منفعت انسانی کے لئے استعمال کرے۔

قوانینِ فطرت:

فطرت میں کارفرما اِن قوانین میں سے ایک بڑا قانون ''قانونِ مکافاتِ عمل(Law of Requital) کہلاتا ہے۔

کائنات کا نظام رب العالمین نے اس طرح ڈیزائن کیا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا ایک ردِعمل ہوتا ہے۔ خیر کا نتیجہ خیر اور شر کا نتیجہ شر ہی نکلتا ہے جیسے ہی کسی کام کی ابتدا کی جاتی ہے اس کا نتیجہ مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جلد یا بدیر اس کے نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ اس قانون پر ایمان رکھنے کو ہی ''ایمان بالغیب'' کہا جاتا ہے۔

انفرادی خلاف ورزی کی سزا انفرادی سطح پر ہی ملتی ہے اور اجتماعی سطح پر کی گئی خلاف ورزی کا خمیازہ پوری قوم یا ساری دنیا کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کی بڑی مثال موجودہ دور میں ماحولیاتی تباہی کی وجہ سے پیدا ہونے والی موسمیاتی تبدیلیاں ہیں جو ماحول کو مزید تباہ کر رہی ہیں۔

دوسرا قانون ''قانونِ تولید(Law of Sexual Reprodution) کہلاتا ہے۔

قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ:

''میرا بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے جبکہ میری بیوی (صاحبہ) نہیں'' (الانعام:101)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

''ہم نے ہر شئے کا جوڑا بنایا، خلق الازواج کا کہا (زاریات:49)

یہاں سے یہ قانون اخذ ہوتا ہے کہ نر و مادہ کے ملاپ کے بغیر نسل آگے نہیں بڑھ سکتی۔ مزید براں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کسی مقام پہ یہ نہیں فرمایا کہ انسان (آدم) کو بغیر ماں باپ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ پیدا کیا جیسا کہ عمومی عقیدہ ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

تیسرا بڑا قانون ''قانون علت و معلول'' ہے(Law of Cause and Effect) ہر معلول(Effect) کی

ایک علت (Cause) ہوتی ہے لہٰذا اس کارگاہ ہستی میں کوئی واقعہ بھی ماوراء عقل نہیں ہوتا۔ ماضی کے وہ واقعات جنہیں معجزہ، کرامت یا جادو کہا جاتا تھا وہ دراصل ہمارے علم وعقل کی گرفت میں نہ آتے تھے مگر علم انسانی میں اضافے کے ساتھ یہ واقعات اب بچوں کا کھیل لگتے ہیں۔

''کل کا غائب آج کا شہادہ بن جاتا ہے''

ملائکہ:

کائنات کی تخلیق کے ساتھ اس کے نظام کو خوش اسلوبی سے چلانے والی قوتیں (ملائکہ) بھی وجود میں آئیں جیسے جیسے ارتقائی عمل آگے بڑھتا گیا ملائکہ کی قسموں اور تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مختلف قوتیں رکھنے والے ملائکہ وجود میں آئے قرآن انہیں دو پروں والے تین پروں والے اور چار پروں والے ملائکہ کہتا ہے۔ (فاطر: 1)

قرآن کے مطابق ملائکہ نظر نہیں آتے البتہ ان کے مظاہر سے ان قوتوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔

اللہ پاک نے جو کام ان کے ذمے لگایا وہ یہ انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ اسی کو ان کی تسبیح کہتے ہیں یہ انکار نہیں کر سکتے۔

چوں چرا کرتے ہیں اور نہ ہی تھکتے ہیں لَا یَسۡتَكۡبِرُوۡنَ (5:82) وَمَا يَسْطُرُوْنَ (68:1)

یہی ان کا سجدہ ہے۔

نظام کائنات چلانے والی ان قوتوں Forces کو موجودہ زمانے کی سائنس

Centripetal Force

Centrifugal Force

Wind Power

شمسی توانائی Solar Energy

Hydral Power

ایٹمی توانائی Atomic Energy

کشش ثقل Gravity

Electro- Magnatic Field

کے نام سے جانتی ہے۔

سورہ سجدہ کی پانچویں آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ (32:5) کہ اللہ جب کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ سکیم

ابتداء سے انتہا تک اللہ کے سامنے ہوتی ہے۔اس سکیم کا انتہائی پست درجہ سے آغاز ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ نشوونما پا کر درجہ بدرجہ اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتی ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ (85:13)

صرف ''کن فیکون'' کہنے کی دیر ہوتی ہے (یہ کہنا بھی نہیں پڑتا۔ایسا ہمیں سمجھانے کے لئے لکھا ہے)

اب اس عمل میں کتنا عرصہ لگتا ہے یہ اللہ پاک ہی بہتر جانتے ہیں کہ اللہ کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال (32:5) اور دوسری جگہ فرمایا کہ ہمارے پچاس ہزار سال (المعارج:4) کے برابر ہے۔

جیسا کہ اللہ نے فرمایا کہ اس کائنات کو چھ ایام میں بنایا گیا (50:38؛7:54) یہاں یوم کہا ہے دن (Day) نہیں۔ عربی زبان میں یوم کے معنی ہیں دور، عہد یا قرن (EON) کے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سائنسدان بھی تخلیقِ کائنات کو چھ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں دو یوم ''دخان''(Nebula) کی سٹیج سے زمین میں وجود آنے تک خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ (41:9) اور چار یوم میں زمین کی آبادکاری ہوئی وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ (41:10) اس کے تخلیقِ کائنات کے چھٹے یوم میں انسان کو پیدا کیا گیا (41:9-12)

13.8 Billion Years	Nebula-----Big Bang	پہلا یوم
4.5 Billion Years	Big Bang-----Earth form	دوسرا یوم
3.8 Billion Years	Haeden Eon	تیسرا یوم
2.5 Billion Years	Archean Eon	چوتھا یوم
540 Million Years	Proterozoic Eon	پانچواں یوم
To Date	Phanerozoic eon	چھٹا یوم

''کن فیکون'':

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کُن کہا اور کائنات کا انتہائی پست درجہ سے آغاز ہوا۔ابتداء میں اس خلاء کے کنارے میں ایک عظیم الجثہ بادل وجود میں آیا جسے قرآن ''دخان''(41:11) اور سائنس (Primary Nebula) کہتی ہے۔اس بادل کے حجم کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہی بادل کائنات میں پھیلی کروڑوں کہکشاؤں میں موجود اربوں کھربوں سیاروں اور ستاروں کی بنیاد بنا۔اور یہ اندازہ ہمیں حیرت کے سوا کچھ نہیں دیتا۔(سدرۃ المنتہیٰ)

''دخان'' ایٹم (ATOM) کے بنیادی ذرات (QUARKS 10-15MM) اور (LEPTONS) پر مشتمل تھا جو مرکز کے گرد گھوم رہے تھے ان کے آپس میں ٹکرانے اور ملنے سے (PROTON) اور (NEUTRON) پیدا

ہوئے جن کے Electron سے مختلف تناسب کے ساتھ ملنے سے بہت سے عناصر (Elements) وجود پذیر ہوئے اب تک 118 مختلف عناصر دریافت کئے جا چکے ہیں۔ ان عناصر کے آپس میں ملنے سے مختلف سالمے (Moluculfs) وجود میں آتے ہیں جو مادہ کی مختلف اشکال کی صورت ملتے ہیں۔

اس بادل میں ذرات گھڑی مخالف سمت (Anti Clockwise) سمت میں مرکز کے گرد گھوم رہے تھے یہی گردش بعد ازاں دوسرے عناصر کے Electron اور سیاروں کو ودیعت (Transfer) ہوئی۔

ہماری زمین بھی گھڑی مخالف سمت میں گھوم رہی ہے چاہے یہ حرکت دوری (Axial) ہو یا محوری (Orbital) ضمناً یہ حقیقت بھی دلچسپ ہے کہ زمانہ قدیم سے گھڑدوڑ اتھلیٹکس اور طوافِ کعبہ بھی گھڑی مخالف سمت میں ہوتا ہے۔

گردش کرتے ذرات کی حرکت تیز ہوئی، ٹکراؤ بڑھا تو یہ بادل روشن ہو گیا (After Glow) انرجی جب حد سے بڑھی تو یہ بادل دھماکے سے پھٹ گیا (Big Bang) اور اس کے ٹکڑے چاروں طرف پھیل گئے یہ ٹکڑے بھی گھڑی مخالف سمت میں گردش کررہے تھے اور کثیف ہورہے تھے۔ یہی ٹکڑے کہکشاؤں میں تبدیل ہوئے۔ انہی میں ہماری بھی ایک چھوٹی سی کہکشاں (Milky-Way) ہے جس میں تقریباً 300 کروڑ سورج اپنے اپنے نظام شمسی کے ساتھ موجود ہیں۔

ہمارا (Solar Nebula) نظامِ شمسی کی بنیاد بنا جو انتہائی تیزی سے محوری گردش کر رہا تھا اور نبیولا سے نظامِ شمسی کے سیارے ایسے علیحدہ ہوئے جیسے بقول قرآن دائرے میں گھومتی غلیل سے پتھر نکلتے ہیں رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30)

یہ بڑے ٹکڑے (Mother Planet) سے جدا ہونے والے ٹکڑے (Daughter Planet) اس کے گرد گھومتے ہیں۔ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (36:40، 21:33) چاند زمین کے گرد، زمین سورج کے گرد اور سورج اپنے سیاروں کے ہمراہ اپنے مستقر کی طرف رواں دواں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (36:38)

سائنسدان اس مستقر کو (Solar Apex) کہتے ہیں جو Consteuation of Heracule میں ہے اسے سارے عمل میں تقریباً نو ارب سال کا عرصہ لگا ہوگا۔ ہماری زمین جب سولر نبیولا سے علیحدہ ہوئی تو کسی دوسرے سیارے سے ٹکراؤ کے نتیجے میں چاند وجود میں آیا۔ جو زمین کے گرد گردش کر رہا ہے اور زمینی ماحول اور زندگی کے لئے معاون ہے۔

نفس واحدہ:

زمین سورج سے علیحدہ ہوئی تو اس وقت وہ ایک آتشی گولہ تھی اس پر ہر وقت خلا سے Comets اور Meteroids کی بارش ہوتی تھی۔ آتش فشاں لاوہ اگلتے رہتے تھے زمینی درجہ حرارت بہت زیادہ تھا اور فضا زہریلی تھی۔ کروڑوں سال بعد درجہ حرارت کم ہوا، آسمان سے پانی برسا اور سمندر وجود میں آئے۔ تخلیق کائنات کے چوتھے دِن (یوم) پانی سے زندگی کا آغاز ہوا۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (21:30)

مٹی کے خلاصے سے خورد بینی حیات کی ابتداء ہوئی۔

طِيْنٍ لَّازِبٍ (37:11) صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (55:14) سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (23:12)

اور ایک یک خلیاتی جرثومہ (Unicellular) وجود میں آیا۔ قرآن اسے نفسِ واحدہ کہتا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (7:189)

جو جوش نمو سے پھٹ کر ایک سے دو ہوئے پھر دو سے چار اور چار سے آٹھ یوں زندگی کا انتہائی سادہ حالت میں آغاز ہوا۔ لاکھوں سال کے ارتقاء کے بعد Multicellular Opranism وجود میں آئے۔ تخلیقِ کائنات کے پانچویں دن سمندر پودوں (Plants) سے بھر گئے جب یہ پودے خشکی پر پھیلے تو براعظم (Rochini) سرسبز و شاداب ہوگیا۔ آکسیجن ہوا میں بڑھا تو فضا میں اوزون کی تہہ جم گئی اور ہمارے سر پر اللہ پاک نے محفوظ چھت قائم کردی۔ (21:32)

زہریلی گیسیں کم ہوئی تو آب و ہوا زندگی سے موافق ہوئی اور تخلیق کائنات کے چھٹے یوم جانور (Animals) پیدا ہوئے زندگی One Dimsnsional ہوئی مگر شعور کا فقدان تھا۔ ارتقائی عمل تیز ہوا۔ انواع و اقسام کے جانور پیدا ہوئے زندگی Two Dimensional ہوئی اور شعور سادہ Simple Consciousness بیدار ہوا۔ جو جاندار اپنے کو موسم اور حالات کے مطابق نہ ڈھال سکے وہ فنا ہوتے گئے۔ آج ان کے منجمد ڈھانچے (Fossils) پائے جاتے ہیں انسان سے قبل ایک مخلوق پیدا کی گئی جو معدوم ہوگئی سائنسدان اسے (Missing Link) کہتے ہیں۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (15:27)

زندگی کا کارواں یونہی آگے بڑھتا رہا اور تقریباً 1 / 2:2 لاکھ سال قبل بڑے گوریلے Apes کے ساتھ ایک انسان نما مخلوق Hominin نے جنم لیا۔ جس کے ساتھ ہی زندگی (Three Dimensional) ہوگئی اور شعور ذات Self) Consciousness) پیدا ہوا۔

پھر کرہ ارض پر آدم کا ظہور 50000۔40000 ہزار سال قبل ہوا۔ اب ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ارتقائی سیڑھی کے اگلے زینے پر چڑھنے کا وقت قریب آن پہنچا ہے اس زینے پر چڑھنے والے انسان Cosmic Consciousness کے حامل ہوں گے اور زندگی Four Dimensional ہوجائے گی۔ دانشوروں کے مطابق انسانِ کامل Super Human پیدا ہونا ناگزیز ہے۔

ارتقاء کے اگلے قدم بارے قرآن ہمیں تمثیلاً سمجھاتا ہے کہ وہ جاودانی زندگی نہایت ارفع و اعلیٰ ہوگی۔ ایک مثالی معاشرہ ہوگا وہاں جو حاصل ہوگا اس کا ادراک ہم موجودہ سطح زندگی پہ نہیں کرسکتے۔ مگر اس منزل کو وہی پاسکیں گے جو پاکیزہ سیرت و کردار کے حامل ہوں گے اور کتاب اللہ کی روشنی میں جنتی معاشرے کی تشکیل کریں گے۔

جنت زمین و آسمان کو محیط ہوگی وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (57:21)

اس دور میں اللہ اور ملائکہ صف آرا ہوں گے وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (89:22)

اور زمین اللہ کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69)

انسان نما:

50-70 لاکھ سال قبل ارتقائی عمل نے ایک جست لگائی (EMERGENT EVOLUTION) جس کے نتیجے میں شمالی افریقہ کے وسطی علاقہ میں انسان نما مخلوق (Hominin) پیدا ہوئی۔ جہاں ان کے منجمد ڈھانچے آج بھی ملتے ہیں۔ اس کے بعد پیدا ہونے والی مخلوق (Homo - Ergaster) کو پندرہ (15) سے بیس (20) لاکھ سال لگے۔ ٹانگ کی ہڈی سیدھی ہونے میں (جس سے وہ سیدھا چلنے کے قابل ہوئے) اور پاؤں کی پانچویں علیحدہ انگلی کو پاؤں میں ضم ہونے میں جس سے وہ درختوں پر چڑھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے۔ پھر یہ مخلوق Homo Erectus کہلائی جو پتھر کے اوزار استعمال کرتی تھی۔

تقریباً اڑھائی لاکھ سال قبل قدیم انسان (NEANDERTHAL) پیدا ہوئے۔ قدیم انسان افریقہ سے نکل کر عرب کے راستے وسطی ایشیاء اور یورپ تک پہنچے اور دوسرے گروہ یمن' ایران' انڈیا سے ہوتے ہوئے اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پہنچے۔ یاد رہے کہ اس وقت براعظم ابھی جدا ہونے کے مراحل سے گزر رہے تھے۔

50000 ۔ 40000 سال پہلے آدم (HOMO SAPIAN) کی پیدائش کے بعد تمام انسان نما مخلوق معدوم (Extinct) ہوگئی۔

انسان کے علاوہ تمام دوسری مخلوق مجبور محض ہیں ایسا سمجھیں کہ ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چپ لگا دی ہے۔ انہیں پروگرام کردیا ہے یعنی ان کی قسمت لکھ دی گئی ہے لہٰذا وہ اپنے افعال کے ذمہ دار نہیں ہے۔

شیر اپنا شکار چیر پھاڑ کر کھاتا ہے مگر وہ ظالم نہیں کہلاتا اور نہ ہی اُسے اس کی سزا دی جاسکتی کیونکہ وہ پروگرام ہی ایسے کیا گیا ہے البتہ وہ اپنی بھوک سے زیادہ نہیں کھائے گا (آپ نے کسی جنگلی شیر کو فربہ نہیں دیکھا ہوگا) اور نہ ہی زیادہ شکار کرے گا۔ یہ ظلم وہ کر ہی نہیں سکتا انسان ایسا کرسکتا ہے اور کرتا ہے کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا ہے۔ جب انسان پیدا ہوا تو اللہ نے اس میں اپنی روح پھونکی (نفخت فی الروح) یعنی اپنے اختیار وارادے کا ایک شمہ انسان کو عطا فرمایا۔ اسی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرا۔ وہ اس دنیا میں بھی جوابدہ ہے اور آخرت میں بھی (مکافاتِ عمل)۔

شیطان:

سورۃ البقرہ کی اولین آیات میں انسان اور شیطان کی پیدائش کا تمثیلی بیان ہے انسان اور اس کا ہمزاد شیطان دونوں اس دنیا میں اکٹھے بھیجے گئے (15:34) انسان کی پیدائش سے پہلے شیطان کی موجودگی کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا اور یہ کوئی فرشتہ بھی نہ تھا جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ فرشتے حکم عدولی نہیں کرسکتے اور دوسرے یہ کہ تمام فرشتوں نے

انسان کوسجدہ کیا تھا فَسَجَدَ الْمَلٰۗىِٕكَةُ كُلُّهُمْ (15:30)

اصل میں شیطان خارج میں وجود ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ انسان کا ہی ایک جز ولاینفک ہے۔ ہر بندے کا اپنا شیطان ہے۔ قرآن بھی لفظ شیاطین الجن والانس استعمال کرتا ہے۔

شیطان کو سمجھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث تمام بحث پر بھاری ہے۔آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

''شیطان انسانی جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے''

(ترمذی 1172، بخاری 7171، ابوداؤد 4719، نسائی 4025)

انسان کے سفلی جذبات اور اُن کو راستہ دکھانے اور اُن کے لئے دلائل فراہم کرنے والی عقل بے باک کو ہی شیطان کہا گیا ہے جب یہ جذبات بھڑک رہے ہوں تو اُسے شیطان کہتے ہیں اور جب حالت مایوسی ہو تو اُسے ابلیس کہا جاتا ہے یعنی ایک ہی سکے کے دو رُخ۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق نیک اعمال ''حسنات'' سے نفس انسانی توانائی پکڑتا ہے اور شیطان میں کمزوری پیدا ہوتی ہے جبکہ بداعمالی (سیئات) سے شیطان تقویت حاصل کرتا ہے اور نفسِ انسانی کمزور ہوتا ہے بداعمالیاں زیادہ ہوں تو یہی انسان ایک دن سراپا شیطان کہلاتا ہے۔

ہمارے ہاں شیطان کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ قدیم ایران سے مستعار لیا گیا ہے۔

مجوسی مذہب میں دو خداؤں کا عقیدہ تھا۔ نیکی کا خدا (یزدان) اور بدی کا خدا (اہرمن) دونوں طاقتور ایک دوسرے کے مدمقابل لہٰذا خارج میں موجود شیطان کا عقیدہ ایرانی ہے اور ہم نے سوچے سمجھے بغیر اسے اپنا لیا اور شیطان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا حامل قرار دے دیا۔

قرآن پاک میں دی گئی 52 صفات (اسماالحسنیٰ) میں سے چند ہی ایسی ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے مختص ہیں جیسے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) یہ صفات کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا شرک ہے۔مگر ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیطان۔ازل سے ابد تک ہر جگہ موجود، نہ کھاتا پیتا اور نہ سوتا ہے۔

ہمیں ایسے شیطان (کے تصور) سے جان چھڑانے کی ضرورت ہے۔

جنت و دوزخ:

کرۂ ارض پہ جب آدم قدم رنجہ ہوئے تو یہ دنیا جنت تھی اللہ کی وسیع وعریض زمین چار اطراف پھیلی تھی۔ سرسبز و شاداب، خوراک کی فراوانی اور شکار کی بہتات۔

انسان چھوٹے چھوٹے غول (گروہ) کی صورت میں گھومتے پھرتے تھے ایک کنبہ کی صورت، خوش وخرم۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)

ملکیت کے لئے کچھ تھا ہی نہیں اور ملوکیت کے تصور نے ہنوز جنم نہیں لیا تھا۔

قرآن پاک میں جہنم کی دو نشانیاں بتائی گئی ہیں۔

بھوک اور خوف (بھوک میں کھانا اور خوف سے امن اللہ کا انعام ہے) ان دونوں کا اُس وقت کی دنیا میں گزر نہ تھا۔ انسانی ہمزاد شیطان کا بھی کوئی ذکر نہ تھا۔نحیف ولاغرولاچار(Non Entity)۔ پھر انسان نے ترقی کی اور خانہ بدوشی کی زندگی چھوڑ کر تمدنی زندگی اختیار کی۔ملکیت اور ملوکیت نے جنم لیا۔جس نے تفرقہ پیدا کیا۔یہی وہ شجر تھا جس کے قریب آدم کو جانے سے منع کیا گیا تھا۔

مگر ایسا ہوا اور جنتی زندگی انسانوں سے چھن گئی قرآن میں اسے ہبوط آدم کہا گیا۔انسان اور شیطان کو اکٹھا جنت سے بے دخل کیا گیا (الحجر:34)۔

لیکن اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق ہر زمانے اور ہر قوم میں پیامبر بھیجے جنہوں نے اللہ کی دی گئی ہدایت کی روشنی میں انسان کو فردوس گم گشتہ سے روشناس کیا۔مگر انبیاء علیہ السلام اور اُن کے رفقا کے رخصت ہونے کے بعد مفاد پرست گروہ اللہ کے پیغام میں ملاوٹ کرتے۔ردوبدل کرتے اور دین (God Sent) کو مذہب (MAN MADE) میں تبدیل کر دیتے۔

اس کے بعد آنے والے پیامبر اللہ کے احکامات کو انسانی ملاوٹ سے پاک کرتے اور نئی ہدایات کی روشنی میں قوم کی رہنمائی کرتے۔ایسا کرتے صدیاں گزریں اور پھر اللہ تعالیٰ کے آخری پیغام کا وقت آن پہنچا۔قرآنِ کریم کی رہنمائی میں رسول اللہ ﷺ نے تیئیس (23) سال کی جدوجہد سے عدل وانصاف پر مبنی ایک معاشرہ قائم کیا۔ایک ریاست وجود میں آئی جہاں اللہ کا دین قائم ہوا (نظام صلوٰۃ)۔

''زندگی اسی ڈگر پہ لوٹ آئی جس پر اس کا آغاز ہوا تھا''

مگر آپ جناب ﷺ وصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رخصت ہوتے ہی پھر وہی ہوا جو صدیوں سے ہوتا آ رہا تھا۔دینِ اسلام کو ملاں نے مذہب میں بدل ڈالا اور جہنمی زندگی لوٹ آئی۔

مذاہبِ عالم نے دین اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اللہ کے نام پر جو قتل وغارت کی، جو تباہی مچائی۔آج اس کے ذکر سے ہی مہذب دنیا کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔اب دنیا مذاہب سے متنفر ہے۔

مسائل سے گھبرا انسان ایک جدید مذہب کی تلاش میں ہے جو اس کی فردوس گم گشتہ واپس دلا دے۔

آج دنیا کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ جس کی تلاش میں ہیں وہ مذہب نہیں ''دین'' ہے۔دین اسلام جس نے ماضی قریب میں بھی درخشاں نتائج دیئے اور نظری طور پر آج بھی اسی کا دعویدار ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دین اور مذہب کے فرق کو سمجھیں اور انسانیت کو دین اسلام کے حقیقی چہرے سے روشناس کرائیں۔

پرویزؒ

لغات القرآن

ک ت ب

کَتَبَ۔عرب اپنی اعلیٰ نسل کی اونٹنیوں کی شرمگاہ میں لوہے کا چھلہ سا ڈال دیتے تھے تاکہ وہ ہر قسم کے اونٹوں سے حاملہ نہ ہونے پائیں۔اسے کَتَبَ النَّاقَۃَ کہتے تھے۔ابن فارس نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے۔ہمارے ہاں گھوڑیوں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔اسی طرح جب وہ اونٹنی کے نتھنوں کو چمڑے کے باریک تسمہ سے سی کر بند کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنے بچہ کو سونگھ نہ سکے تو اسے بھی کَتَبَ کہتے تھے ❶۔اسی سے مشکیزہ یا بوری کے منہ کو سی کر بند کر دینے کے لئے بھی کَتَبَ کہتے تھے۔یہیں سے لفظ کِتَابٌ ہے' جس سے مراد منتشر اوراق کی حلقہ بندی کر کے انہیں اس طرح مجتمع اور یک جا کر دینا تھا جس طرح بوری میں سامان بند کر کے اسے اوپر سے سی دیا جاتا ہے۔ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔اس سے کِتَابٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو کِتَابٌ کہا ہے تو قرآنِ کریم منتشر اوراق یا کھجوروں کے پتوں یا ہڈیوں کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا نہیں تھا' بلکہ ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب و مدون تھا۔منتشر حالت میں اسے کِتَابٌ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

کَتَبَ۔ چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ایک جگہ محفوظ کیا جاتا ہے اس لئے کَتَبَ کے معنی ''اس نے لکھا'' ہو گئے۔اور اِکْتَتَبَ کے معنی ہیں اس نے خود لکھا یا کسی سے لکھوایا یا کسی سے کہا کہ وہ بولتا جائے اور یہ لکھتا جائے [25:5]۔راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی گھڑ لینے کے ہیں۔

کِتَابٌ کے معنی فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ہیں ❶۔قرآنِ کریم میں کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ [2:178]۔یا کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ [2:183]۔فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ہے۔یعنی جو کام قانوناً لازم قرار دیا جائے۔اسی لئے مجموعہ قوانین کو کِتَابٌ کہا جاتا ہے' کیونکہ اس میں گوناگوں احکام واوامر جمع ہوتے ہیں۔ابن فارس نیز صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اَلْكِتَابُ کے معنی اَلْفَرْضُ اور اَلْحُكْمُ لکھے ہیں۔لہٰذا' جب قرآنِ کریم کو کِتَابٌ کہا گیا ہے تو اس کے معنی

---

❶ تاج

ضابطۂ قوانین کے ہیں۔

سورۃ نور میں ہے وَالَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ [24:33] یعنی (تمہارے غلاموں میں سے) جو آزادی حاصل کرنے کے لئے معاہدہ کرنا چاہیں۔ تحریر مانگیں۔ [2:235] میں حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡکِتٰبُ اَجَلَہٗ کے معنی ہیں جب عدت کی حد جواز روئے قانون خداوندی مقرر ہوگئی ہے' اپنی آخری میعاد تک پہنچ جائے۔

سورۃ یونس میں ہے لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ [7:34]۔ ''ہر قوم کے لئے ایک میعاد ہے''۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر قوم کے مقدر میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس نے اتنی مدت تک عروج حاصل کرنا ہے اور اس کے بعد ختم ہو جانا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ [13:38] ہر میعاد کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ یعنی قوموں کی موت اور حیات خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ جو قوم چاہے اس قانون کے مطابق اپنی میعاد کو بڑھا لے۔ جو چاہے اسے گھٹا لے۔ خدا کی طرف سے صرف قانون مقرر ہے۔ اس قانون کے مطابق اپنی مدت حیات کو گھٹانا بڑھانا' ہر قوم کے اپنے اختیار میں ہے۔

اسی طرح سورہ آل عمران میں ہے وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا [3:145]۔ کوئی شخص خدا کے قانون (طبعی) کے بغیر مر نہیں سکتا۔ یہی قانون اس کی میعاد کا تعین کرتا ہے۔ وَمَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِہٖۤ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ [35:11]۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا' خدا کے مقرر کردہ قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون کا علم انسان کو دے دیا گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس کے مطابق اپنی عمر بڑھا لے' جس کا جی چاہے اسے گھٹا لے۔ (انسان جب جی چاہے خودکشی کر کے مر سکتا ہے۔ اور بدپرہیزی سے اپنی عمر کم کر سکتا ہے)۔ لیکن جب (اس قانون کے مطابق) کسی کی مدت عمر کا خاتمہ ہو جائے تو پھر اس کی موت میں تاخیر نہیں ہو سکتی [63:11]۔

تفسیر المنار میں ہے کہ کِتَابٌ بمعنی مَکۡتُوۡبٌ ہے۔ یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ اور ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ [2:2] سے اشارہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف قرآنِ کریم ہی لکھنے کا حکم فرمایا تھا ❶۔ قرآنِ کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا۔ لہٰذا مکتوب صورت میں صرف قرآنِ کریم ہی موجود تھا جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم میں کِتَابٌ کا لفظ قانون خداوندی یا ضابطہ قوانین خداوندی کے لئے آیا ہے۔ اور چونکہ قرآنِ کریم خود ضابطہ قوانین الٰہیہ ہے اس لئے یہ کتاب اللہ ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کا مجموعہ مرتب اور محفوظ شکل میں۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانون مکافات عمل ہے۔ یعنی یہ قانون کہ انسان کا کوئی عمل بلانتیجہ نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ کریم میں اس نکتہ کی وضاحت مختلف انداز سے کی گئی ہے۔ سورہ انفطار میں ہے وَاِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ﴿۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ﴿۱۱﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ [82:10-12] تم پر (خدا کی طرف سے) ایسی قوتیں مسلط ہیں جو تمہیں ہر طرح اپنی نگرانی میں لئے

❶ تفسیر المنار' جلد: 1' صفحہ: 123

ہیں۔ وہ ''معزز لکھنے والے'' ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ کی تفسیر یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ نے کر دی۔ یعنی علم رکھنے والے۔ جاننے والے۔ ان معنوں میں یہ لفظ (کَتَبَ) اور جگہ بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ طور میں ہے اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ [52:41]۔ یہاں یَکۡتُبُوۡنَ کا مفہوم 'جاننا'' ہے۔ یا سورۃ انبیاء میں ہے وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوۡنَ [21:94]۔ سورۃ نمل [27:28] میں کِتَابٌ کا لفظ خط کے لئے آیا ہے۔ یہی وہ کتاب (چٹھی) ہے جس کے علم کا ذکر [27:40] میں آیا ہے۔

قرآنِ کریم میں کِتَابٌ اور حِکۡمَۃٌ آیا ہے۔ اور دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوان ح۔ک۔م) کِتَابٌ کے معنی ہیں قانون۔ اور حِکۡمَۃٌ کے معنی ہیں اس قانون کی غرض، غایت، مقصد، نتیجہ۔ (The Why of it)۔ مثلاً کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کے بعد ہے لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ [2:183]۔ تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں (یہ کِتَابٌ یا قانون ہے۔ اور) لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ' اس قانون کی حکمت ہے۔ یعنی اس قانون خداوندی سے مقصد یہ ہے' اس کی غایت یہ ہے' اس کی علت یہ ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ تم ایسے ہوسکو۔ قرآنِ کریم نے قانون کے ساتھ اس کی حکمت (یعنی نتیجہ) کو بھی خود ہی بیان کر دیا تاکہ ہم ہر وقت دیکھتے رہیں کہ قانون کا منشاء پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر قانون پر عمل پیرا ہونے سے وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے جسے قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس قانون کی محض رسم پوری ہو رہی ہے' فی الحقیقت اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت تھی جسے قرآنِ کریم نے بیان کیا تھا۔ اسی کے نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہمارے نمازیں اور روزے اس طرح بے نتیجہ رہ گئے ہیں۔ اور ہم انہیں اسی طرح ادا کئے جا رہے ہیں اور مطمئن ہیں کہ اگر ان کے نتائج یہاں مرتب نہیں ہوتے تو نہ سہی' ان کا پھل آخرت میں جا کر ملے گا۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے ان کے نتائج اسی دنیا میں مرتب ہونے کا بھی کہا ہے اور آخرت میں بھی۔ اگر ان کے نتائج (قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق) اس دنیا میں مرتب نہیں ہو رہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو رہا۔ لہٰذا ان کے نتائج آخرت میں بھی مرتب نہیں ہوں گے۔

کِتَابٌ اور حِکۡمَۃٌ (قانون اور اس کے نتائج) دین کا بنیادی نقطہ ہے۔ یعنی قرآنِ کریم اور اس پر عمل پیرا ہونے کے درخشندہ نتائج جو اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں اور جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس لئے جہاں قرآنِ کریم سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فلاں معاملہ میں خدا کا حکم (قانون) کیا ہے وہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس حکم (قانون) پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ اگر قرآنِ کریم سے یہ معلوم اور متعین کرلیا جائے اور پھر ہم اس کے مطابق اپنا (انفرادی اور اجتماعی) محاسبہ کرتے جائیں تو ہمیں ہر وقت معلوم ہوسکتا ہے کہ قرآنِ کریم پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نفس کا جھوٹا اطمینان غلط عمل کو بھی صحیح بنا کر دکھا سکتا ہے۔

پرویز علیہ الرحمہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

میرا پیام

میری کوشش یہ ہے کہ کسی طرح ملک کو ان تباہیوں سے بچا لیا جائے۔

آپ نے غور فرمایا، برادرانِ عزیز! کہ قانون سازی کے سلسلہ میں یہاں مذہب اور دین کی کشمکش کس شدت سے جاری ہے۔ میری پکار یہ ہے کہ قانون سازی کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائے جسے خود قرآنِ کریم نے تجویز کیا ہے اور جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں، یعنی جن احکام و قوانین کو قرآنِ کریم نے متعین شکل میں دے دیا ہے انہیں اسی طرح نافذ کیا جائے اور جن امور کو اس نے اصولی حیثیت سے بیان کیا ہے ان کی جزئیات، ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اسلامی حکومت، اُمت کے باہمی مشورہ سے متعین کرے۔ ایسا کرنے سے ان جزئیات کو بھی جو پہلے کبھی متعین ہوئی تھیں، یقیناً پیش نظر رکھا جائے گا وہ قانون سازی کے سلسلہ میں نظائر کا کام دیں گی۔

حضور ﷺ کی سیرت طیبہ:

احادیث کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کی بلند سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کو نوعِ انسان کے لئے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) قرار دیا ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی سیرت کے نمایاں خط و خال کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن جزئی واقعات، کتبِ احادیث و تاریخ (سیر) میں پائے جاتے ہیں۔ ان کتابوں میں غلط اور صحیح ہر قسم کی باتیں آ گئی ہیں جس کی وجہ سے ان میں ایسے ایسے واقعات بھی ملتے ہیں۔ جن سے حضور ﷺ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔

اسی طرح قرآنِ کریم نے جماعتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بڑی تعریف کی ہے اور مہاجرین و انصار کے متعلق تو بالتخصیص کہا ہے کہ وہ مومنِ حقا (پکے اور سچے مومن) تھے لیکن ہماری کتب تاریخ میں ان کے متعلق بھی ایسے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ان پر بڑا طعن پڑتا ہے۔

میری دعوت یہ ہے کہ ان کتبِ احادیث و تواریخ پر اس انداز سے نظر ثانی کی جائے۔ کہ ان میں سے تمام قابل اعتراض

مواد خارج کر دیا جائے۔ تا کہ حضور ﷺ کی سیرت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی اپنی صحیح اور پاکیزہ شکل میں دنیا کے سامنے آئے۔لیکن یہ کام بھی اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے۔ اگر اسے انفرادی طور پر کیا جائے گا تو افراد کا تعصب یا عقیدت صحیح منزل تک پہنچنے کے راستے میں حائل ہو جائے گی۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت' ان کتابوں کو___ جو انسانوں ہی کی مرتب کردہ ہیں___ وحیٔ آسمانی کی طرح تنقید سے بالا قرار دیتی ہے۔ وہ اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا کوئی گوشہ (معاذ اللہ) داغدار ہو جائے' یا صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی قابل اعتراض شکل میں سامنے آئے۔لیکن وہ اسے نہیں برداشت کر سکتی کہ ان کتابوں کے مصنفین یا مؤلفین کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ ان سے کوئی غلطی یا سہو ہوا ہے۔ دیکھئے! اسلاف پرستی انسان کو کہاں تک لے جاتی ہے؟ لیکن مذہب کی تو بنیاد ہی اسلاف پرستی پر ہے۔

اسلامی مملکت سے مقصود کیا ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' مذہب کی رُو سے دنیا اور آخرت میں ثنویت ہوتی ہے اور ایک مذہب پرست انسان کی تمام تگ و تاز کا ماحصل اور سعی و کاوش کا منتہیٰ' یہ ہوتا ہے کہ اس کی عاقبت سنور جائے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کس قسم کی گزر رہی ہے بلکہ ان کے نزدیک خدا کے مقرب بندوں کی نشانی یہ ہے کہ ان کی اس دنیا کی زندگی نہایت عسرت اور افلاس میں گزرے___ جو یہاں جس قدر ذلیل ہوگا وہ وہاں اسی قدر واجب التکریم ہوگا۔ ان کے نزدیک' اسلامی مملکت سے مقصد اتنا ہی ہے کہ وہ چور کے ہاتھ کاٹ دے۔ زانی کو سنگسار کر دے۔ شرابی کے کوڑے لگائے' زکوٰۃ کا روپیہ اکٹھا کر کے' مذہبی تعلیم اور تبلیغ کے کاموں پر صرف کرے۔ حج کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے۔ وقس علی ذالک۔

لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے اسلامی مملکت کے قیام کا منتہیٰ' کچھ اور ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جائیں گی اور احکام اسلامی کی پابندی ضروری ہوگی۔لیکن یہ تمام امور ذریعہ ہوں گے ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا___ اور وہ مقصد یہ ہے کہ یہاں ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار اس طرح جاری و ساری ہوں جس طرح فضا میں صاف اور خوشگوار ہوا رواں دواں رہتی ہے کہ ہر متنفس اس سے بلا کاوش و مشقت سامانِ زیست حاصل کرتا رہتا ہے ان اقدار کے مطابق معاشرہ کے متشکل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے جنت کی جن نعمتوں اور آسائشوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دنیا میں ہر فرد معاشرہ کو از خود ملتی چلی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی' اس کی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی رہتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی جنتِ اُخروی کی زندگی بسر کرتا ہے جس معاشرہ میں خدا کی مستقل اقدار جاری و ساری نہ ہوں' اس میں افراد معاشرہ کی یہ زندگی بھی جہنم کی زندگی ہوتی ہے' اور مرنے کے بعد بھی وہ جہنم ہی میں رہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا مقصد افرادِ معاشرہ کو اس دنیا اور اگلی دنیا دونوں میں' جنت کی زندگی عطا کرنا ہے۔لہٰذا اس بات کے پرکھنے کا معیار کہ جو حکومت کسی جگہ قائم ہے وہ اسلامی ہے یا نہیں یہ ہے کہ اس میں افرادِ مملکت کو وہ سامانِ زیست

میسر ہے یا نہیں جسے نعمائے جنت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور انہیں اپنی ذات کی نشوونما کے مواقع حاصل ہیں یا نہیں اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمیں آخرت میں جنت ملے گی یا نہیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہماری یہاں کی زندگی جنت کی زندگی کے مشابہ ہے یا نہیں ___ یاد رکھیئے! قرآنِ کریم کی رُو سے‘ ایمان اور اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ‘ اس دنیا اور آخرت‘ دونوں میں جنت کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس اس کا فیصلہ یہ ہے کہ:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72)

جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا۔ دنیا‘ آخرت کی کھیتی ہی نہیں بلکہ وہ آخرت کے پرکھنے کی کسوٹی بھی ہے۔

معاشرتی خرابیاں:

ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ جہاں دو آدمی ملیں گے‘ وہ معاشرتی خرابیوں کا رونا روئیں گے ___ بلکہ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ روتے روتے آنسو ہی خشک ہو گئے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ (غالبؔ کے الفاظ میں) ___ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں ___ یہ خرابیاں اس قدر عام‘ اور معاشرہ کا معروف چلن بن گئی ہیں کہ ان پر رونے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ البتہ ان پر بطور فیشن‘ منبر اور اسٹیج دونوں سے آنسو ضرور بہائے جاتے ہیں۔ منبر سے یہ آواز عادۃً صبح وشام دہرائی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اس لئے ان میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ کبھی نہیں بتایا جاتا کہ مسلمانوں نے کیا چھوڑا ہے جس کا فطری نتیجہ یہ خرابیاں ہیں‘ اور وہ کیا کریں جس سے یہ خرابیاں فی الواقعہ دور ہو جائیں۔

یہی کیفیت اسٹیج کی ہے۔ وہ وزیر ہو یا امیر‘ صنعت کار ہو یا زمیندار‘ مستقل لیڈر ہو یا ہنگامی مقرر ___ کوئی تقریب ہو یا کسی قسم کا اجتماع ___ تان یہاں ٹوٹے گی کہ مسلمانو! تم اپنی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھال لو۔ تمہارے سارے کام سنور جائیں گے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتائے گا کہ وہ سانچہ ہے کیا جس میں ڈھلنے سے یہ خرابیاں رفع ہو جائیں گی۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہ خرابیاں غلط نظامِ زندگی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ (یا یوں کہیئے کہ وہ غلط نظام کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں) اور افراد بالعموم اُن سے ملوث ہوتے ہیں۔ جب تک وہ نظام نہیں بدلا جاتا‘ معاشرہ کی خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں۔۔۔ نہ ہی ان خرابیوں کی یہ صورت ہے کہ کسی ایک شعبہ کو لے کر اس کی خرابیوں کی اصلاح شروع کر دی جائے۔ اس سے اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔ جہنم سارے کا سارا جہنم ہوتا ہے۔ اس کے کسی ایک گوشے کو جنت میں بدل نہیں سکتے۔ چیچک کا علاج الگ الگ آبلوں پر مرہم لگانے سے نہیں ہو سکتا۔ پورے جسم کے خون کو زہریلے جراثیم سے پاک کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے غلط نظام کی پیدا کردہ خرابیوں کا علاج اسی صورت میں ممکن ہے‘ کہ اسے صحیح نظام سے بدلا جائے ___ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114)۔ خدا کا بتایا ہوا طریق علاج ہے۔ یعنی سَیِّٔات کے دور کرنے کا طریق یہ ہے کہ انہیں حسنات سے بدل دیا جائے۔ حسنات صحیح معاشرہ کے کاروبار کا نام ہے۔ صحیح معاشرہ میں‘ افراد کی چھوٹی موٹی لغزشوں کے

نقصانات ان کے حسنِ عمل کے عالمگیر نتائج سے ڈھک جاتے ہیں (53:32) لہٰذا جب تک ہم اپنے موجودہ غلط نظام معاشرت، نظامِ معیشت، نظامِ سیاست وغیرہ کو قرآنی نظام سے نہیں بدلیں گے۔ معاشرہ کی خرابیاں دور نہیں ہوسکیں گی۔ صحیح قرآنی نظام میں، صوم وصلوٰۃ اور حج اور زکوٰۃ سب اپنے اپنے خوشگوار نتائج مرتب کرتے ہیں۔ غلط نظام میں یہ محض رسومات بن کر رہ جاتی ہیں اور جب ان کا کوئی زندگی میں نتیجہ سامنے نہیں آتا تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ ان سے ثواب ہوتا ہے جو آخرت میں ہماری نجات کا ذریعہ بنے گا۔

میری دعوت یہ ہے کہ موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ قرآنی نظامِ زندگی قائم کیا جائے تاکہ معاشرہ کی خرابیاں دور ہوں۔ ہمیں دنیا میں خوشگواری اور سرفرازی کی زندگی نصیب ہو۔ اور ہماری عاقبت بھی سنور ے ___ (بقیہ صفحہ نمبر: 34 پر)

(بقیہ صفحہ نمبر: 25 سے آگے) اس دعوت کی مخالفت ہر اس گروہ کی طرف سے ہوتی ہے ___ خواہ وہ مذہب پرستوں کا ہو یا دنیاداروں کا ___ جو غیر قرآنی معاشرہ ہی میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں اور قرآنی معاشرہ میں انہیں اپنا وجود خطرہ میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تمام مخالفت میں، میں کسی سے ذاتی طور پر قطعاً نہیں اُلجھتا۔ میری مخالفت بھی اصول کے لئے ہوتی ہے اور موافقت بھی اصول کی خاطر۔ اس تگ وتاز میں، میں ذاتیات کو درمیان میں لاتا ہی نہیں ___ قرآن کریم جب لَآ اِلٰہَ کہہ کر دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار کی نفی کرتا ہے، تو اس سے اس کا مقصود کسی سے ذاتی مخاصمت یا نفرت نہیں ہوتا۔ وہ ہر اُس اُصولی نظریہ یا نظام کی مخالفت کرتا ہے جس میں قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کو صاحبِ اقتدار تسلیم کیا جائے ___ ملوکیت، سرمایہ داری یا مذہبی پیشوائیت سے میری مخالفت اسی لَآ اِلٰہَ کے اصول کی متابعت کی وجہ سے ہے تاکہ اس انکار سے اِلَّا اللہ کے مثبت مقام تک قوم کو لے جایا جا سکے۔

انقلابی آواز:

یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس (30) سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی ___ جو شخص لوگوں کے سامنے اُن کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے، پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُسے، ان کا مسلمہ لیڈر، راہنمائے شریعت یا مرشدِ طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص اُن کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے، انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے، وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی۔ اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا، اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اس کا قائد بن جانا میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں ان تمام نگاہ فریب

جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر قرآن کی آواز پر لبیک کہوں۔ اور اس طرح دنیا جہاں کی مخالفت مول لے لوں۔ میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے، سوچتے، سمجھتے کیا اور مجھے اس پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُرخار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے' تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اُسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے - مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے۔ جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے' مذہب' چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں ___ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں ___ یہ تو دین کا خاصہ ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے' ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں۔ اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہیں رہے' تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق' ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا' اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہو جانے کے بعد' اگر اُس قوم کے سامنے دین نہ ہو' تو وہ دہریت اختیار کر لیتی ہے اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں' سیاست' مستقل اقدار سے الگ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبال کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی' اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آ جائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو' تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگۂ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے ___ یہاں اس وقت جو آپ مذہبی پیشوائیت کا جوش و خروش دیکھ رہے ہیں یہ مذہب کی حرکت مذبوحی اور رقصِ بسمل سے زیادہ کچھ نہیں۔ مجھے خطرہ یہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب اِدھر کا رُخ کرے' یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطۂ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے۔ یہ ہے میرا وہ احساس اور اس کے ماتحت میری یہ آرزو اور ارادہ جس کی بنا پر میں دنیا جہان کی مخالفت مول لے کر' مروجہ مذہب کے ایک ایک گوشے کو سامنے لاتا اور اس کی جگہ دینِ خداوندی پیش کئے جا رہا ہوں، اس اُمید پر کہ ___ ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہوگی ___ لہٰذا میری دعوت اور پیغام کا ملخص (کم از کم) پاکستان میں' انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی جگہ خدا کے عطا کردہ دین کی حکمرانی کو قائم کرنا ہے۔

جب میں نے پہلے پہل یہ آواز بلند کی تو اپنے آپ کو تنہا پایا___ بالکل تنہا___ لیکن قرآن کریم کی صداقتوں پر یقین محکم نے میری دستگیری کی اور ان جانکاہ تنہائیوں کے باوجود' میں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کیا۔ ''اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' کی نوید حیات بخش مجھے پکارتی ہوئی آگے بڑھاتی چلی گئی___ مجلہ طلوعِ اسلام' لاکھوں کی تعداد میں شائع شدہ پمفلٹ، میری تصانیف، تقاریر، خطبات، مذاکرات نجی گفتگوئیں، اس فکر کی نشر و اشاعت کے ذرائع تھے۔ آہستہ آہستہ یہ فکر فضا میں پھیلتی اور رفتہ رفتہ قلوبِ سلیم میں اترتی چلی گئی اور ایک ایک دو دو کر کے مجھے رفیق سفر ملنے شروع ہو گئے۔

طلوعِ اسلام کی بزمیں:

جب ان کی تعداد کچھ زیادہ ہوگئی تو بعض رفقاء نے یہ تجویز پیش کی کہ بجائے اس کے کہ ہم انفرادی طور پر اس فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں' کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ایک بستی یا شہر کے رہنے والے متفقینِ فکر' اجتماعی طور پر اس کی نشر و اشاعت کریں۔ تجویز معقول تھی۔ اسے اختیار کر لیا گیا۔ اور یوں طلوعِ اسلام کی بزموں کا وجود عمل میں آ گیا۔

طلوعِ اسلام کی بزمیں' سیاسی پارٹیاں ہیں، نہ مذہبی فرقے۔ نہ ہی انہیں کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے تعلق ہوتا ہے او رنہ ہی یہ عملی سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔ ان بزموں کا مقصد' اس قرآنی فکر کی اجتماعی طور پر نشر و اشاعت ہے اور بس___ انہیں یونہی سمجھئے جیسے بزمِ اقبال' جس کا مقصد فکرِ اقبال کی نشر و اشاعت ہوتا ہے۔ میرے پیشِ نظر صرف فکری انقلاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے پیغام کا اولین مخاطب' قوم کا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ہے۔

اس تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے نہ کبھی پبلک سے چندہ مانگا ہے نہ قربانی کی کھالیں نہ صدقات وزکوٰۃ کے پیسے جمع کئے ہیں۔ اس کے مرکزی اخراجات پورے کرنے کا بنیادی ذریعہ میری کتابوں کی آمدنی ہے یا کسی ہنگامی ضرورت کے لئے احباب کا تعاون' بزموں کے اراکین اپنی اپنی جگہ اس فکر کی نشر و اشاعت کا انتظام خود کرتے ہیں۔ اس تحریک کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ' اس قدر عالمگیر مخالفت کے باوجود کسی مقام پر رُکی نہیں۔ دن بدن آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط (62:4)

میری پوزیشن:

اس سلسلہ میں اتنا اور واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری پوزیشن' قرآنِ کریم کے ایک ادنےٰ طالب العلم اور مبلغ کی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے قرآنِ کریم پر غور و فکر کیا ہے اور اسی غور و فکر کے نتیجے کو میں اوروں تک پہنچاتا ہوں۔ اپنی فکر کو نہ میں حرفِ آخر سمجھتا ہوں' نہ سہو و خطا سے منزہ___ جو مجھے میری کسی غلطی سے آگاہ کرے میں اس کا شکر گزار ہوتا ہوں لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ مجھے یہ بتایا جائے کہ میری پیش کردہ فکر کس طرح قرآنِ کریم کے خلاف ہے کیونکہ میرے نزدیک دین میں سند خدا کی کتاب ہے۔ مجھے نہ مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے نہ دوسرے مسلمان بھائیوں سے کسی قسم کی الگ اور ممتاز حیثیت کا زعم___ قرآنِ کریم نے ایمان کے جو اجزائے خمسہ متعین کئے ہیں___ یعنی خدا' ملائکہ' انبیاء' کتب اور آخرت___ ان

پر میرا ایمان ہے۔ اور ایمان ہے ان تصریحات کے مطابق جنہیں خود قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے۔ اور میری دعوت کی حد آخر یہ ہے کہ وہی نظریۂ زندگی، وہی نظامِ حیات مستحق حمد و ستائش ہوسکتا ہے جو خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر ہو۔

تعلیمی اسکیم:

خدا کی اس صفتِ ربّ العالمینی کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے ___ بالفاظ دیگر اسلام کو بہ حیثیت ایک نظام زندگی متشکل کرنے کے لئے ___ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام اور اس تصور کو اجاگر کیا جائے۔ اس وقت تک میں نے یہی کیا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کریں کہ اس نظامِ خداوندی کا قیام ان کے جذبات کا تقاضا، ان کی آرزوؤں کا مرکز، ان کی کوششوں کا محور، اور ان کی زندگی کا مقصد بن کر ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔

ہمارا نظامِ تعلیم:

بدقسمتی سے ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم بڑا ناقص اور ہماری ابھرنے والی نسلوں کے لئے سمِ قاتل ہے۔ میں نے اس اٹھارہ برس میں، قوم کی توجہ اس اہم اور بنیادی مسئلہ کی طرف منعطف کرانے کی کوشش کی، لیکن دیکھا یہ کہ قوم کو سرِ دست، کسی سنجیدہ معاملہ کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں۔ اس نے زیادہ سے زیادہ کیا تو اتنا کہ اسکولوں اور کالجوں میں، اسلامیات کے پیریڈ کا اضافہ کر دیا۔ یا اُسے ایم۔ اے میں ایک مضمون کی حیثیت دے دی۔ اس ''اسلامیات'' نے نوجوان طالبعلموں کو اور بھی مذہب گزیدہ بنا دیا۔ پہلے اگر وہ دین سے بیگانہ تھے تو اب وہ اس سے متنفر ہو گئے اور اس کے بعد یکسر سرکش ___ یہ ہیں وہ نوجوان جو اس وقت قوم کے لئے ایک مسئلہ (پرابلم) بن رہے ہیں۔ (حالانکہ یہ پرابلم خود قوم ہی کی پیدا کردہ ہے) یہی ہیں وہ نوجوان جو آئندہ چل کر خود ایک قوم بن جائیں گے۔

ان حالات میں مَیں نے سوچا کہ اگر مروجہ نظام و نصابِ تعلیم کو ملک گیر حیثیت سے بدلنا میرے بس میں نہیں، تو کم از کم، میں ایک ایسی درسگاہ (کالج) کے قیام کی کوشش کروں جس میں صحیح قرآنی تصورات کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام ہو جس میں طریقۂ تعلیم یہ ہو کہ طالبعلم طبعیات پڑھیں یا عمرانیات، تاریخ پڑھیں یا فلسفہ ___ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ___ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبہ سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل میں کس طرح ممد و معاون ہوسکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ قرار دیا ہے۔

یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ ___ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے ___ بالفاظِ دیگر، اس تعلیم و تربیت کے ذریعے طالب علموں کے دل و دماغ میں اس

حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہوجائے گی جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں___ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ جب تک اس انداز کی اپنی یونیورسٹی قائم نہ ہو، اس کالج میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدے کے مطابق دی جائے' تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل طالبعلم زندگی کے کسی شعبے میں دوسرے کالجوں کے طالبعلموں سے پیچھے نہ رہ جائے___ یاد رکھیئے___! میں اپنی قوم کے نوجوانوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوں۔ ان میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ لیکن یہ ہماری غلط تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی یہ صلاحیتیں صحیح اقدار کے ساحلوں کے اندر رہ کر' جوئے حیات بخش بننے کے بجائے حدود نا آشنا سیلاب بے پناہ بن جاتی ہیں جس کا نتیجہ تباہیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ان کی صلاحیتوں کو انسانیت ساز اقدار کا پابند بنا دیا جائے تو آپ دیکھئے کہ یہی نوجوان' کس طرح تقدیرِ ملت کے درخشندہ ستارے نہیں بن جاتے۔!

میرے پیشِ نظر کالج کا مقصود یہی ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنی عمر کے اس آخری حصہ میں' اپنی قوم کے بچوں اور بچیوں کو لے کر بیٹھ جاؤں، اور کم از کم' آنے والی نسلوں کے لئے ایک طیب اور صالح خمیر تیار کر جاؤں___ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ___ اس مقصد کے لئے ''قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی'' کے نام سے ایک سوسائٹی بنالی گئی ہے جسے حکومت کے ہاں سے رجسٹرڈ کرالیا گیا ہے۔ 25بی گلبرگ (لاہور) اس سوسائٹی کا دفتر ہے اور محترم مرزا محمد خلیل صاحب اس کے خزانچی جن کے نام پر عطیہ جات موصول ہوتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے قواعد وضوابط چھپ چکے ہیں۔ اور اس اسکیم میں دلچسپی لینے والے حضرات انہیں سوسائٹی کے دفتر سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں دیئے جانے والے عطیات کو' سنٹرل گورنمنٹ نے' انکم ٹیکس سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا ہے۔ یہ سوسائٹی' ادارہ طلوعِ اسلام سے الگ ہے اور اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا حساب کتاب بھی الگ ہے۔!

یہ ہے عزیزانِ من! میرے سامنے (یوں کہئے کہ) میری زندگی کا آخری نصب العین۔ لیکن اس کا حصول' ظاہر ہے کہ میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ میں ان تمام احباب سے' جو میری قرآنی فکر سے متفق ہیں اور اس درسگاہ کی اسکیم کو مفید خیال کرتے ہیں' اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے اس سوسائٹی سے تعاون کریں۔ اگر آپ احباب کی رفاقت سے یہ درسگاہ قائم ہوگئی تو مجھے یقین ہے کہ یہ' ہمارے تعلیمی نظام میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے مثال کا کام دے گی۔ اس سے ہماری قوم ایک نیا موڑ مڑ جائے گی۔ اس سے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل جائے گا اور اس میں حصہ لینے والوں کا نام زمانے کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ جس طرح سرسید کا دارالعلوم' تشکیلِ پاکستان پر منتج ہوا' چہ عجب کہ یہ درسگاہ پاکستان کو ایک صحیح اسلامی مملکت میں تبدیل کرنے کا موجب بن جائے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز___! میرا آخری پیغام۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

The Human Self and Allah

Episode No. 13

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

5.4 Knowledge of Thingsand Islam

This is why it is said that the task of the *Jamaat*of *Momineen* should be this, that they should take the things of the universe one by one, and after lifelong experimentation and observation anda period of research and investigation, prove this that Allah has not created anything uselessly and without purpose. Today the West expresses pride on this aspect that they have made great progress in the physical sciences. There is no doubt that this isin fact a reasonfor pride and acclaim. When the Quran stated that Adam deserves the prostration of angels to him and the system of the universe has been subjugated to man, then those individuals or nations who harness the forces of nature, fulfill this aim. But fourteen hundred years ago,the Quran had stated about the *JamaateMomineen*:

Behold! In the creation of the heavens and the earth, and the alternation of night and day – there are indeed signs for men of understanding. Men who reflect (Zikr) in the Laws of Allah, standing, sitting, and lying down on their sides and contemplate the (wonders of) creation in the heavens and the earth. (thus reaching this conclusion) 'Our Sustainer! Not for naught have You created this! Glory to You! Give us freedom from the penalty of the fire'. (3:190-191)

From this it also became clear what is meant by '*Zikr*' of Allah i.e. reaching this truththrough observation and study of nature that this system is functioning according to Divine laws, and nothing in the universe is created futilely and without purpose. But thedifference

between a *Momin* thinker and a Western thinker will be that, after discovering the things of nature,the Western thinker will wander around in the valleys of conjecture and speculation to determine their purpose and need. Though he will determine the properties and characteristics of the different 'constituents of the universe', he will declarethe sum total of these individual constituents i.e. the whole of the universe,as being purposeless and meaningless. He will searchfor the benefits and advantages of 'creation' (created things) in microscopic detail,but regarding the Creator of this beneficial and advantageous creation, he will hold the belief that He is (Allah forbid) a 'blind nature'which is devoid of aim, intent and wisdom. In other words, he will termeachindividual part of a machine as being useful but will declare the sum total of these parts, i.e. the machine,to bepurposeless, and will consider the Creator of this machine (Allah forbid) as being 'intellectually blind'.

You can now conclude yourself whether this is the following of intellect or the death of intellect! Contrary to this, a wise *Momin* will prove from these very same discoveries,that the creation of the universe is not the work of a 'blind nature' but is the act of such a Being Who is Wise, Knowledgeable, All-Seeing and All-Knowing. From the usefulness of its parts,he will prove that the whole machine is beneficial and advantageous, and from the usefulness of the whole machine, that the Creator of the machine is knowledgeable and wise, and from this he will reach the conclusion that this system of the universe has not come into existence without necessity and purpose, instead it has been brought into existence for the achievement of a grand andsplendid purpose under the auspices of the infinite wisdom of Allah,All-Wise and All-Seeing. In other words, a wise *Momin* will keep strengthening this*Eimaan* of his, which was based on the 'unseen',in the light of the dynamic and lively results of tangible and evidence-basedexperiments and experiences, with vision and knowledge, and in this way will prove that:

...I do invite unto Allah – on evidence clear as the seeing with one's own eyes...(12:108)

5.5 Science and Muslims

The style of a Muslim is that standing, sitting, walking about, he should keep reflecting and pondering on everything which is present in the universe. When moving, he is invited to the attraction of the pleasantness and beautyof the lilies and poppies; and when he sits, he canvisualize millions of suns concealed within each and every particle of sand; and when helies down, the star studded ceiling of the heaven discloses itslong concealed secrets of astronomy to him; and in this way, by pondering on each and everything, he should prove that:

...Not for naught have You created this universe...(3:191)

What a display of shutting the eyes to reality it is to allege about such a Deen that it is againstknowledge of the sciences. But how can we complain about others,when Muslims themselves demonstrateby their own conduct that these alive and perennial verses of Allah, the Ever-Living and Established, are for the purpose of reciting for mere'*Sawab*' and by'Allah's *Zikr*' is meant the counting of rosary beads. And then by proclaiming that this system of the universe is not false, pointed towards another fact. The doctrine of some philosophers is that there is no existence of the things which we see all aroundus anywhere outside of the human mind; these are just manifestations of our thoughts, nothing exists in itself outside of this. This type of belief is also to be found among Hindus, according to which they call this universe *Maya* (mirage) i.e. which does not exist in itself,rather is merely the name of the self-deception of the human mind. Discussion of the philosophical aspect of this belief will be carried outat another place but by conceiving the universe to be an illusion and mirage, the deadly effects which this has on the practical life of man do not require

further explanation. This is why the Quran made it clear that this system of the universe is not *Batil* (false)but is *Haqq*(truth). Its creation is *bil-Haqq* and holds a purpose. Furthermore, the meaning of*bil-Haqq*is for the establishment of constructive effects:

See you not that Allah created the heavens and the earth bil-Haqq? If He so will, He can remove you and put (in your place) a new creation! (14:19) See also (16:3)

5.6 The Universe Has Been Created *bil-Haqq*

Bil-Haqq also means that everything is created with a view to a specific purpose. Wherever it has been placedin this grand machinery,it fits precisely, and it is busy working to fulfil that purpose for which it has been created. By this the mind shifts to this fact that the power which is running this system is not some blind nature but is a knowledgeable and wise Being Who Himself is *Haqq* and whatever He has created is also *Haqq*. In other words, by the very fact of this system of the universe being *Haqq*,this provides evidence of the Creator of the universe being *Haqq*. These are those verses, those signs from which the heart of a *Momin* achieves the paradise ofcontentment and assurance:

Allah created the heavens and the earth Bil-Haqq: verily in this are signs for Momineen. (29:44) See also (30:8)

This system of the universe being *bil-Haqq* is an established fact. There is never the slightest discrepancywithin the system under which it is unwaveringly functioning. If it had come into existence purely by chance, it would have been scatteredand dispersed long ago. Do you not see that whenever there is the slightest error in the functioning of a system of railways i.e. it moves away slightly from '*Haqq*', then how much devastationresults in it. Hence, this subjugation of the sun and

the moon, this alternation of the night and day, this process of everything carrying out its assigned tasks according to its own respective measures according to precise time and defined scales, does it not point to this fact that all this is the consequence of the infinite wisdom of a Wise and All-Knowing Being:

He created the heavens and the earth bil-Haqq: He makes the night overlap the day, and the day overlap the night: He has subjected the sun and the moon (to His law) so each one follows a course for a time appointed. Is He not the Exalted in Power – He Who protects as per His laws. (39:5)

From these verses we come to know that this system of the universe is not created by chance without purpose andnecessity:

We created not the heavens and the earth and all between them, merely in (idle) sport (Laa'ebeen)! (21:16) See also (44:38-40)

Where by the use of one word *Laa'ebeen*(sport),the Quran points to the creation of the universe being *bil-Haqq*, it also invalidatesa false belief by this. It is a belief of Hindus that *Parthwi* (earth) and *Akaash* (sky) is the *Laila* (playmate) of *Ishwar* (God). In other words, by the creation of the earth and heavens, God is playing a sport (Allah forbid) and is entertaining himself. When he becomes bored with the sport then, just as children demolish their sandcastles themselves, he,too,will scatter and disperse this system. Related to this,the name of one God(Shevjee) among them, *Natrajan* i.e. a Raja of players, is a very big player. This is the reason why the Quran did not consider it sufficient to merely declareit as*Batil* (false) but by adding the word *Laa'ebeen*to it, contradicted this belief with forcefulness. Clearly,fourteen centuries ago no one in Arabia would have known that this kind of belief even existed in the world.

5.7 Reflection in the System of the Universe

Then, since this scheme of the universe is created in truth (*bil-Haqq*),that is why it has been repeatedly emphasised to reflect and ponderon it. That thing which has come into form by chance without any purpose and need, or which has been made merely for sport, who gives an invitation to ponder and reflect on it? The question of reflection and reasoning only arises when some system is working under some special wisdom. At one place it is stated:

Do they see nothing in the government of the heavens and the earth and all that Allah has created?(7:185)

And at another placethat there are signs for people of wisdom and intellect inthe manifestations of nature:

Among His Signs is this that He created you from dust; and then -behold, you are men scattered (far and wide)! And among His Signs is this, that He created for you mates from among yourselves, that you may dwell in tranquility with them, and He has put love and mercy between your (hearts); verily in that are signs for those who reflect. And among His Signs is the creation of the heavens and the earth, and the variations in your languages and your colours: verily in that are signs for those who know. And among His Signs is the sleep that you take by night and by day, and the quest that you (make for livelihood) out of His Bounty: verily in that are signs for those who hearken. And among His Signs, He shows you the lightning, by way both of fear and of hope, and He sends down rain from the sky and with it gives life to the earth after it is dead: verily in that are Signs for those who are wise. (30: 20-24)

5.8 The Beauty of Creation

And not only this, but an invitation is extended to reflect and ponder on this system of nature and witness whether in such a grand system of the universe which astounds the intellect, is there any fault, any error, any omission, any disorder, any unsuitability, any lack of proportion, any mistake, any creasevisible anywhere? Is there any chanceto point the finger at anything?

-4 وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

-5 وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

-6 کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

-7 وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

-8 مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

-9 ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

-1 کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

-2 جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

-3 جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

-4 جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان وکائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

-5 جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

-6 جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.76
ISSUE
02

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam